مُطالعۂ حدیث

مولانا محمد حنیف ندوی

ادارہ ثقافت اسلامیہ

مطالعۂ حدیث

مولانا محمد حنیف ندوی

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

طبع اول ۱۹۷۹

تعداد ۱۱۰۰

محمد اشرف ڈار (اعزازی معتمد) نے الحمرا آرٹ پرنٹرز۔لاہور
سے چھپوا کر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے شائع کی۔

پیش لفظ

ازمنۂ مظلمہ کے بعد مغرب میں نشاۃ ثانیہ کے نام سے آزادئ فکر و دانش کی جو کشمکش لہرا اٹھی۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ سب سے بڑا سبب چرچ کی وہ احمقانہ چیرہ دستیاں تھیں، جن کی وجہ سے ایک طرف تو حکومت و ریاست کا عادلانہ اور انسانیت پر مبنی تصور معطل ہو کر رہ گیا تھا، اور دوسری طرف علوم و فنون اور تحقیق و اکتشافات کی راہیں یکسر مسدود ہو گئی تھیں۔ مزید برآں احتساب کا عمل اس درجہ ظالمانہ اور ہمہ گیر تھا کہ کوئی شخص بھی اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

اس سیاسی و فکری گھٹن کا منطقی ردِ عمل یوں رونما ہوا کہ لوگ پاپائیت کے فرسودہ عقائد کے خلاف دیوانہ وار اٹھ کھڑے ہوئے اور بالآخر اس کی پاداش میں بہت سی تکالیف اور آزمائشوں سے دوچار ہونے کے بعد ریاست و اقتدار کی باگ ڈور اس طبقہ سے چھین لینے میں کامیاب ہو گئے۔ کلیسا کے خلاف یہ ردِّ عمل اتنا شدید تھا کہ مغرب کے مفکرین و دانشور اس جدوجہد میں حدود و اعتدال کو قائم نہ رکھ سکے اور ملحدانہ افکار و نظریات کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ ریاست و حکومت جو پہلے نام نہاد مذہبی روایات پر استوار تھی، اب خالصتہً لادینی سانچے میں ڈھل گئی۔ یہی نہیں مذہب کے خلاف نفرت بڑھی اور لوگ ایسے خیالات و تصوّرات کے لیے نت نئے صنم کدوں کی تلاش و تعمیر میں مصروف ہو گئے جو ان کے لیے مذہب سے محرومی کے بعد ذہنی و فکری سکون مہیا کر سکیں۔ حالانکہ یہ نعمت صرف روحانی اقدار کو اپنانے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ دین کو چھوڑ دینے سے نہیں۔

ہمارے ہاں عالمِ اسلام میں بھی ایک عرصے سے نشاۃ ثانیہ کی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں لیکن ان کا مقصد اور سمتیں یورپ کی تحریک احیا سے کوئی مناسبت

نہیں رکھتیں، اس لیے کہ ہمارے ہاں سرے سے چرچ یا پاپائیت کا وہ تصور پایا ہی نہیں گیا، جس کی وجہ سے شرفِ انسانی مجروح ہو، فکر و نظر پر قدغن عائد ہو اور عقل و خرد کے قافلوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔

ہمارا دین کھلے بندوں کائنات میں تفکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے، عقل و دانش کی تابانیوں کو سراہتا ہے اور مسلمانوں سے بجا طور پر توقع رکھتا ہے کہ وہ ہر دور میں علم و حکمت کے پرچم کو اونچا رکھیں گے۔ نیکی اور معروف کو معاشرہ میں پھیلائیں گے اور تمام قسم کی انفرادی و اجتماعی برائیوں کے خلاف برسرپیکار رہیں گے۔

اس بنا پر ہمارا اشکال نہ تو یہ ہے کہ اہلِ مغرب کی طرح دین و ریاست کو خواہ مخواہ دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا جائے۔ اور نہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ارتقا کی مخالفت کی جائے۔ ہمارا مسئلہ صرف اور صرف یہ ہے کہ اپنے دین کی روحانی اور اخلاقی قدروں سے کما حقہٗ آشنا ہوں، اس کے اوامر و نواہی کو اچھی طرح جانیں، اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول سے، عشق و شیفتگی کی پرانی مگر رچ پور روایات کو از سرِ نو زندہ کریں۔ اور پھر رشد و ہدایت کے ان سرچشموں کی روشنی میں ایسے مثالی اور ترقی پسند معاشرہ و ریاست کی تعمیر میں سرگرم عمل ہو جائیں، جس میں عصری تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ، خدا ترسی، احساسِ ذمہ داری، عدل و دیانت پاکیزگی اور نظم و ضبط ایسی اخلاقی و دینی خوبیوں کا چلن اور چرچا ہو۔

زیادہ واضح پیرایۂ بیان میں یوں کہنا چاہیے کہ ہم جس مثالی معاشرے کی تشکیل کے خواہاں ہیں اس میں اور مغرب کے مزعومہ مثالی معاشرہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جہاں مغرب صرف مادی وسائل میں توسیع و توفیر کا طالب ہے اور صرف آج یا حال کی نشاط آفرینیوں پر قانع ہے وہاں ہماری ذمہ داری دوہری ہے۔ ہمیں حال کی کامرانیوں کے پہلو بہ پہلو اس جاودان مستقبل پر بھی نظر رکھنا ہے جس کا تعلق ہماری اُخروی زندگی کی فلاح و بہبود سے ہے۔ کیونکہ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس بات پر اعتماد نہیں رکھتے کہ زندگی اور حیات کا مسئلہ جسم و جاں کے موجودہ حیاتیاتی روابط ہی کا

رہینِ منت ہے۔ لہٰذا جہاں یہ روابط ختم ہوئے، زندگی کا شعلہ بجھا، اور انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عدم کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہوگیا۔ ہمارے نزدیک زندگی ترکیب عناصر سے تعبیر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص عنایت کا نتیجہ ہے، اور اس کا سلسلہ عقبیٰ کی ابدیت تک وسعت پذیر ہے۔ ہماری ذمہ داری دوگونہ ہے۔ ہمیں ایک دن اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری دینا ہے، اور دنیا کی بہرہ مندیوں کے ساتھ ساتھ آخرت کے انعامات سے بھی بہرہ مند ہونا ہے۔ مزید براں معاشرہ کی اجتماعی اصلاح و تعمیر کے علاوہ ہمیں اس نقطہ نگاہ سے فرد کی تربیت و تزکیہ کا بیڑا بھی اٹھانا ہے کہ یہ دونوں مملکتوں کا کامیاب شہری بن سکے۔ اس مملکت کا بھی جس کا تعلق اس عالم آب و گِل سے ہے اور اس مملکت کا بھی جس کو مسیحی پیرایۂ بیان میں خدا کی بادشاہت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسلام کے مثالی معاشرے کے بارے میں ہمارا یہ تجزیہ اگر صحیح ہے تو اس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ ہمیں تعمیر وارتقا کے لیے بہرحال آسمان سے ہدایات حاصل کرنا ہے اور انسان کے بنائے ہوئے ارضی و ناقص دستورِ حیات کے بجائے ترازو کی تول ان اصولوں کی روشنی میں اپنے لیے لائحہ عمل ترتیب دینا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ازراہِ کرم پہلے سے متعین کر رکھا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں وہ آسمانی ہدایات قرآن و سنت کی واضح شکل میں میسر ہیں، جن کا تعلق وحی و تنزیل کی لازوال ضوفشانیوں اور برکتوں سے ہے۔

تاریخ شاہد ہے۔ قرآن و سنت ہی ہمارے لیے وہ دو اہم روشن اور بنیادی ماخذ ہیں جن سے استفادہ کر کے ماضی میں ہم نے تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور فقہ و قانون کے خوش رنگ دبستان سجائے ہیں اور اس عالم آشفتہ کی زلف و کاکل کو سنوارا اور چمکایا ہے۔

مغرب کے دانشور اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ مثالی ریاست و معاشرے کے قیام کے سلسلے میں ہماری کوششیں ضرور بارآور ہوں گی، بشرطیکہ ہم

نے کتاب وسنت ایسی مستند، محفوظ اور حیات آفرین روایات کو عملی جامہ پہنایا اور زندہ اور برقرار رکھا جو چودہ سو سال سے ہمارے معاشرہ میں جاری وساری ہیں اور جن کے بل پر ہمارے اسلاف نے صدیوں پہلے اپنی علمی برتری اور فکری عظمت کے جھنڈے چار وانگ عالم میں گاڑے تھے اور اس طرح پوری انسانیت سے خراجِ تحسین وصول کیا تھا۔

مغرب جہاں اور اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار ہے وہاں اس کے لیے یہ امر بھی خاصی پریشانی کا باعث ہے کہ کہیں مسلمان جو اپنے عقائد وتہذیب کی برتری و عظمت کی بدولت ایک طویل عرصے تک چیلنج بنا رہا ہے دوبارہ وہ کھویا ہوا مقام حاصل نہ کرلے، جو اس کو پھر سے ایک عالمی تحریک اور ایک عالمی قوت کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر ابھار دے۔

اس خطرے کے سدِّباب کے لیے مغرب کے شاطروں نے تقسیمِ کار سے کام لیا، سیاسی قوتوں نے تو استحصال اور استعمار کی بقا کی خاطر مسلمانوں میں تفریق وعلیحدگی کے بیج بوئے۔ اور عالمِ اسلامی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور مستشرقین نے علم وتحقیق کا بھاری بھرکم مورچہ سنبھالا، تاکہ دونوں گروہوں کے باہمی تعاون اور ملی بھگت سے اپنی ہوسِ اقتدار وبالادستی کی تسکین کا سامان فراہم کرسکیں۔ اس بظاہر علمی مگر بباطن سیاسی تنظیم نے پالیسی یہ طے کی کہ مسلمانوں کو ان کے تشخص ملی سے محروم کرنے کی غرض سے ادب وتحقیق کے ریشمی رومالوں میں لپٹا ہوا ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو ان کے روایتی فخر وپندار کو یکسر زائل کردے، اور اس لٹریچر میں ان کے علوم و معارف، تہذیب وتمدن اور مآخذِ دینی کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ان کی اہمیت خود ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ تاکہ یہ بھی شک دار نیاب کی اسی راہ میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھریں، جس پر کہ یہ ایک عرصے سے خود گامزن ہیں۔

مستشرقین کی ان کوششوں کی افسوسناک کڑی یہ ہے کہ یہ براہِ راست قرآن وحدیث کو ہدفِ تنقید ٹھہرانے سے بھی نہیں چوکے۔ قرآن حکیم کے اسلوب بیان ترتیب اور تصورِ وحی وتنزیل کے بارے میں ان کے اعتراضات کی نوعیت کس درجہ

سطحیت اور انھلے پن کی آئینہ دار ہے اس کی پوری پوری تفصیل ہم اپنی کتاب مطالعہ قرآن میں بیان کر چکے ہیں۔ اس وقت ہمیں ان اعتراضات کا جائزہ لینا ہے، جن کا تعلق فنِ حدیث سے ہے۔ ان اعتراضات کا خلاصہ یا حاصل یہ تین نکات ہیں:

۱۔ حدیث کی تدوین و تالیف آنحضرتؐ کے بعد ان تاریخی و فقہی تقاضوں کی وجہ سے معرض عمل میں آئی، جن سے فقہاءِ مذاہب تیسری صدی ہجری میں وقتاً فوقتاً دوچار ہوتے رہے۔

۲۔ فنِ حدیث میں رجال و رواۃ کی ثقاہت وضعف پر تو بلاشبہ بڑی تفصیل سے بحث کی گئی۔ لیکن نفس مسئلہ یا متن کی چھان بین کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔

۳۔ بعض لوگوں نے امراءِ وقت کی خوشنودیِ مزاج حاصل کرنے کی غرض بے دریغ حدیثیں گھڑیں۔

ہم نے اس کتاب میں ثابت کیا ہے کہ حدیث و سنت کی تدوین تاریخی تقاضوں کے بجائے خالصتہً دینی عوامل کی بنا پر ہوئی ہے اور اپنے دامن میں یہ اس طرح سے استناد، اتصال اور تسلسل کو لیے ہوئے ہے جس کی دنیا کے تاریخی لٹریچر میں نظیر نہیں پائی جاتی۔ ہم اس میں اس حقیقت کا اظہار بھی کر چکے ہیں کہ محدثین کرام نے نہ صرف رواۃ کے بارے میں جرح و تعدیل سے کام لیا ہے بلکہ ان پیمانوں اور اصولوں کی تشریح بھی فرمائی ہے جن کے بل پر متن و نفس مضمون کی صحت و استواری کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ رہا تیسرا اعتراض تو اس کا بھی ہم نے اس کتاب میں تفصیل سے جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ فتنہ وضع حدیث کب ابھرا، کن اسباب و وجوہ نے اس کو تقویت پہنچائی اور محدثین کرام نے اس کے انسداد کے لیے کیا کیا مساعی جمیلہ انجام دیں۔ نیز اس سلسلے میں کن ایسی علمی و تحقیقی کسوٹیوں کی نشان دہی کی، جن کے ذریعے نہ صرف موضوع حدیثوں کو آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے بلکہ ان سے فن تاریخ میں ان حقائق کی تعیین بھی کی جا سکتی

ہے جو صحیح اور درست ہیں اور ان واقعات کو بھی دائرۂ علم و ادراک میں لایا جا سکتا ہے جو تصحیف و الحاق کی دخل اندازیوں کا کرشمہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ حدیث و سنت کے ذخائر محض انوارِ رسالت اور فیوضِ نبوت کے ان پہلوؤں ہی کی عکاسی نہیں کرتے جو ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں، بلکہ اپنے جلو میں حفظ و صیانت کے ان علوم و معارف کو بھی لیے ہوئے ہیں جن کی بنا پر کسی واقعہ کے مدارج صحت و ضعف کا تعین ہوتا ہے۔ یہ علوم و معارف کیا ہیں اور احادیث نے آنحضرتؐ کے زمانہ سے لے کر عہدِ تدوین تک حفظ و صیانت کے کن مرحلوں کو طے کیا اور کیونکر علم و حکمت کے یہ لعل و گہر اتصال و تسلسل کے ساتھ، ہم تک پہنچے۔ ان تمام امور کو جاننے کے لیے اصل کتاب کا مطالعہ ضروری ہے جو چھوٹے بڑے پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں ان تمام فنی مباحث کی تفصیل مذکور ہے، جن کو جانے بنا حدیث کا کما حقہٗ علم حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

محمد حنیف ندوی

فہرست مضامین

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (الانبیاء: ۱۰۷)

اور (اے محمد) ہم نے تم کو تمام جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ○ (الفرقان: ۵۶)

اور ہم نے (اے محمد) تم کو صرف خوشی اور عذاب کی خبر سنانے کو بھیجا ہے

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ○ (الم نشرح: ۴)

اور (ہم نے) تمہارا ذکر بلند کیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ
وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ
اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○ (النساء: ۵۹)

مومنو! خدا اور اس کے رسول کی پیروی کرو اور جو تم میں سے صاحب امر ہیں ان کی بھی، اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف رائے واقع ہو تو اگر خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ۝ (النساء ۶۱)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم خدا نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف رجوع کرو اور پیغمبر کی طرف آؤ تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تم سے اعراض کرتے اور رکے جاتے ہیں۔

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ (النساء: ۱۱۵)

اور جو شخص سیدھا رستہ معلوم کرنے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کے سوا اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور قیامت کے دن جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔

قرآن حکیم اور اطاعتِ رسول

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس میں تشریع و قانون کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان تمام بنیادی مسائل کو بیان کیا گیا ہے جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں :

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ - (النحل : ۸۹)

اور ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی جس میں ہر شے کی وضاحت ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (الانعام : ۱۱۴)

حال آنکہ اس نے تمہاری طرف واضح المطالب کتاب بھیجی۔

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ

(ہود : ۱، ۲)

الرا۔ یہ کتاب وہ ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کر دی گئی ہیں۔

آئیے! ان آیات کی رُو سے دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کس درجہ ضروری ہے، اور آپؐ کے منصب یا فرائض کار میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں تاکہ ہر مسلمان صحیح خطوط پر اپنی دینی زندگی کے نقشے کو ترتیب دے سکے، قرآن حکیم کے مطالب و معانی کو سمجھ سکے اور ان کو اپنی عملی زندگی میں سمو سکے۔ قرآن حکیم نے اس سلسلے میں دو انداز اختیار کیے ہیں۔ اکثر تو اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کو بھی ضروری ٹھہرایا ہے اور کہیں صرف رسول کی اطاعت و پیروی ہی کا ذکر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دینی نقطۂ نظر سے قرآن کے پہلو بہ پہلو، اسلام اور فقہ و تقنین کا دوسرا سرچشمہ یا مصدر ثانی جس سے ایمان و عمل کے تقاضے مکمل ہوتے

ہیں، سنتِ رسول ہے:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (آل عمران: ۳۲)

کہہ دو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم مانو، اگر نہ مانیں تو خدا بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۲)

اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحمت کی جا سکے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

(النساء: ۵۹)

مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو، اور اگر کسی بات میں اختلاف پیدا ہو تو اگر خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور رسول اور اپنے اولی الامر کے حکم کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (الانفال: ۱)

اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ ۚۖ (الانفال: ۲۰)

ایمان دارو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اس سے روگردانی نہ کرو، اور تم سن رہے ہو۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا (الانفال: ۴۶)

اور خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا، ایسا کرو گے تو بزدل ہو جاؤ گے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (النور: ۵۴)

کہہ دیجیے کہ خدا کی فرمانبرداری کرو اور رسولِ خدا کے حکم پر چلو، اگر منہ موڑ و گے تو رسول پر اس چیز کا ادا کرنا ہے جو ان کے ذمہ ہے اور تم پر اس چیز کا ادا کرنا ہے جو تمھارے ذمے ہے اور اگر تم ان کے فرمان پر چلو گے تو سیدھا راستہ پا لو گے۔ اور رسول کے ذمے تو صاف صاف احکامِ خدا کا پہنچا دینا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ (محمد: ۳۳)

مومنو! خدا کا ارشاد مانو اور پیغمبر کی فرمانبرداری کرو اور اپنے عملوں کو ضائع نہ ہونے دو۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (مجادلہ: ۱۳)

اور خدا اور اس کے پیغمبر کی فرمانبرداری کرتے رہو اور جو کچھ تم کرتے ہو، خدا اس سے باخبر ہے۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (التغابن: ۱۲)

اور خدا کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اگر تم منہ پھیر لو گے تو ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کھول کر پہنچا دینا ہے۔

یہ وہ آیات ہیں جن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت فرمانبرداری کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں دونوں کی اطاعت و پیروی کو یکساں طور سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ یعنی جو اسلوب، انداز اور پیرایۂ اظہار اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے اختیار کیا گیا ہے، بعینہٖ وہی نہج اور طریق اطاعتِ رسول کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اب ان آیات پر ایک نظر

ڈالنے چلیے جن میں اطاعتِ رسول کو مستقل بالذات، اور منفرد دین کی اساس اور بنیاد قرار دیا گیا ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج (النساء: ۸۰)

جو شخص رسول کی پیروی کرے گا تو بے شک اس نے خدا کی پیروی کی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط (النساء: ۶۴)

اور ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (آل عمران: ۳۱)

لوگوں سے کہہ دیجیے اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ خدا تمھیں دوست رکھے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا۔ اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ٥

(النور: ۶۳)

تو جو لوگ آپ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہ ایسا نہ ہو ان پر کوئی آفت آپڑے یا تکلیف والا عذاب نازل ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ٥ (النساء: ۶۵)

آپ کے پروردگار کی قسم، یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں اور جو آپ فیصلہ کردیں اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے تسلیم کرلیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

یہ آیات اپنے مفہوم و معنی میں اس درجہ واضح ہیں کہ ہم نے ان کی تشریح و تفسیر کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، البتہ ان آیات سے جو نکات نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آتے ہیں ان پر ایک نظر ڈال لینا چاہیے۔

۱ - اطاعتِ رسول، دین کی اتنی اہم اساس ہے کہ اس سے انکار کفر کا مستوجب ہے۔

۲ - اللہ کے رسول کی اطاعت رحمتِ الٰہی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

۳ - کسی بھی فقہی و دینی مسئلے میں اختلاف رائے کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۴ - اللہ اور اس کے رسول کے پیغام پر ایمان کے تقاضے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں، جب کہ حضورؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کو حرزِ جان بنایا جائے۔

۵ - اطاعتِ رسول کی روگردانی سے حبطِ اعمال کا اندیشہ ہے۔

۶ - رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے مترادف ہے۔

۷ - ہر پیغمبر اسی لیے مبعوث ہوا ہے کہ لوگ اس کے نقشِ قدم پر چلیں۔

۸ - محبتِ الٰہی صرف ایسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ آنحضرتؐ کے ارشادات و اعمال کی پیروی کی جائے۔

۹ - جو لوگ آپ کی تعلیمات کی مخالفت میں سرگرم ہیں، ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔

۱۰ - ایمان اس وقت تک تکمیل پذیر نہیں ہوتا جب تک آنحضرتؐ کے احکام و اوامر کو پورے اخلاص سے تسلیم نہ کیا جائے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن نے آنحضرتؐ کے منصب اور فرائض کار کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے تو اس کو سمجھنے کے لیے نامناسب نہ ہوگا کہ پہلے تصوّرِ نبوّت سے متعلق ان خیالات و افکار کا اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا جائے۔ جو یکسر ملحدانہ اور غلط ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس موضوع میں اصل اشکال یہ ہے کہ نبوّت کا مسئلہ خالص دینی ہے اور جب اس کو حل کرنے کے لیے عقل و خرد کی واماندگی پر اعتماد کیا جائے گا تو اس سے لازماً نبوّت کی عظمت و

حقیقت پر روشنی نہ پڑ سکے گی اور نہ یہ بات واضح ہو سکے گی کہ انبیا کی تعلیمات میں جو ایک طرح کا توافق اور ارتقا و تسلسل پایا جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ جس طرح سائنس کے مسائل کو غیر سائنسی اصولوں کی روشنی میں حل نہیں کیا جا سکتا، ٹھیک اسی طرح وہ مسائل جن کا تعلق خالصتاً دین سے ہے، ان کو غیر دینی وسائل و ذرائع کے بل بوتے پر حل کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اس کا کیا کیجیے، بعض لوگوں نے اس کے باوجود اسرارِ نبوت تک پہنچنے کی ناکام کوشش کی۔ مثلاً کچھ لوگوں نے اسے کہانت کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا، حالانکہ نبوت اور کہانت میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ جن لوگوں نے عربی ادبیات میں کاہنوں سے منقولہ اقوال کا مطالعہ کیا ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جہاں ارشاداتِ انبیا حکمت و دانائی اور رشد و ہدایت کے موتی ضو فگن ہیں، گہرائی اور عمق ہے، وہاں کہانت میں ڈھلے ڈھلائے، بے معنی اور سطحی جملوں کے سوا کوئی چیز پائی نہیں جاتی۔ کاہن کو انبیا و رسل سے وہی نسبت حاصل ہے جو ذرہ کو آفتاب سے ۔۔ ان کے اقوال میں نہ صحت و بصیرت کی کوئی جھلک ہے، نہ زندگی کے مسائل سے متعلق کوئی پیغام و دعوت کا نظام پایا جاتا ہے، نہ اخلاق کو سنوارنے کی تعلیم ہے اور نہ اللہ تعالیٰ سے رشتۂ عبودیت استوار کرنے کا کوئی طریق مذکور۔ کیونکہ یہ ساری چیزیں انبیا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ نبوت اس شدید احساس و تاثر کا نتیجہ ہے، جو معاشرے میں فکر و نظر کی گمراہیوں کو دیکھ کر ایک ذہین اور حساس مصلح انسان کے دل میں ابھرتا ہے۔ ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ معاشرے میں مروجہ برائیوں کے خلاف، اصلاح کا جذبہ بعض حضرات کو اس حد تک مجبور کر دے کہ وہ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن ان کے لیے یہ کیا ضرور ہے کہ وہ اپنے کو فرستادہ تصور کرنے لگیں اور اپنے خیالات و افکار کو وحی و تنزیل کا نتیجہ قرار دیں۔

نبوّت کی ایک توجیہ نفسیات کے ماہرین نے یہ بیان کی ہے کہ یہ ایک نوع کی ذہنی بیماری ہے اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص جو ذہنی و فکری لحاظ سے عدمِ توازن کا شکار ہے، متوازن و معقول اور قابلِ عمل نظامِ حیات پیش کر سکے، اعلیٰ اخلاقی و روحانی قدروں کو پیش کر سکے، تہذیب و تمدن کے سانچوں کو ترتیب دے سکے اور ان تمام گتھیوں کو سلجھا سکے، جن سے معاشرہ دوچار ہے۔ یہی نہیں، خود بھی ایسی پاکیزہ اور بلند زندگی بسر کر سکے، جو دوسروں کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتی ہو۔

نبوت کے بارے میں یہ ان لوگوں کی توجیہات تھیں جو ادیان کی صداقت اور سچائی پر یقین نہیں رکھتے اور محض ظن و تخمین کی بنا پر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دینی ذہن رکھتے ہیں، لیکن اس کے باوصف انھوں نے ٹھوکر کھائی ہے اور اس مسئلے کی تہ تک نہیں پہنچ پائے۔ مثال کے طور پر بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ نبوّت ولایت ہی کے اس مقام سے متعلق ایک حقیقت ہے جہاں پہنچ کر مجاہدہ و ریاضت سے سالک کا قلب اس لائق ہو جاتا ہے کہ اس پر وحی و تنزیل کی تجلیات کا انعکاس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نبوّت اور ولایت میں جو فرق ہے وہ نوعیت کا نہیں درجے کا ہے۔

ہمارے نزدیک نبوت کی متصوفانہ تعبیر اس وجہ سے غلط ہے کہ قرآن کریم سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہو پاتا کہ منصبِ نبوت سے بہرہ مند ہونے سے پہلے ہر نبی نے سلوک و معرفت کی وہ تمام منزلیں طے کی ہوں، جن کی صوفیا نے نشان دہی کی ہے۔ مزید برآں اس سے عقیدۂ ختمِ نبوت کی نفی ہوتی ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کسبی ہے وہبی نہیں۔ یعنی اگر آج بھی کوئی شخص تعلق باللہ کی اس منزل تک رسائی حاصل کر لے جس کو معرفت و سلوک کی اصطلاح میں آخری منزل کہا جا سکتا ہے تو وہ نبوّت و رسالت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو سکتا ہے۔

حالانکہ کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان اس کا قائل نہیں۔ نبوّت و ولایت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ نبی وحی و تنزیل کے ذریعے جن حقائق تک رسائی حاصل کرتا ہے وہ تمام تر معروضی ہوتے ہیں اور ولی کے قلب و ذہن پر جو نقوش مرتسم ہوتے ہیں وہ موضوعی ہوتے ہیں، اور ان کا تانا بانا، معاشرے کے حالات، اقدار و تعلیم و تربیت کے اسلوب و نہج سے تیار ہوتا ہے، اور ان میں جو تھوڑی بہت معروضیت پائی جاتی ہے، وہ بھی صاف اور واضح نہیں ہوتی بلکہ تعبیر طلب ہوتی ہے۔ ان نقوش و تاثرات کو ہم کشوف تو کہہ سکتے ہیں، وحی نہیں، کشوف کی شرعی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ سالک کے ذاتی تجربات ہیں۔ لہٰذا ہر حال میں ان کی صحت کا معیار یہ ہے کہ آیا یہ کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق ہیں یا نہیں۔ جس طرح ایک مجتہد کا استدلال و استنباط صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی، اسی طرح کشوف میں بھی خطا و صواب دونوں کا امکان موجود ہے، بلکہ علامہ ابنِ تیمیہ کی زبان میں یہ کہنا چاہیے کہ کشف بھی ایک طرح کے اجتہاد ہی سے تعبیر ہے۔

دینی حلقوں میں ایک نہایت محدود اور بزعمِ خود غلط حلقہ ایسا بھی ہے جو نبوت و وحی کو اس سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی تنزیل کے لیے کسی شخص کو منتخب کر لیتا ہے تاکہ وہ اس کتاب کے متن اور الفاظ و حروف کو من و عن لوگوں تک پہنچا دے، لیکن اس کے اقوال و تشریحات اور عمل و کردار کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بھی وحی و تنزیل کا نتیجہ ہوں، لہٰذا حجت و استدلال کا جہاں تک تعلق ہے اس کا سرچشمہ صرف وہ کتاب ہوگی جو اس پر نازل ہوئی ہے پیغمبر کا عمل اور ارشادات نہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے پیغمبر کی حیثیت محض مبلّغ اور شارح کی ہے، شارع کی نہیں۔ ان کے ہاں ہر دور کے اہلِ علم کو یہ حق ہے کہ وہ معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے طور پر کتاب اللہ کی تشریح کریں، شرع و تقنین کے سانچوں کو ڈھالیں، دین کی جزئیات اور تفصیلات کو

متعین کریں اور لوگوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیں۔

نبوت و رسالت کا یہ گمراہ کن تصوّر در اصل اس مفروضے پر مبنی ہے کہ وحی الٰہی کا دائرہ صرف کتاب اللہ تک سمٹا ہوا ہے اور اس کی وسعتیں اور ضو فشانیاں نبی کے اعمال اور ارشادات کو متاثر نہیں کر پاتیں۔ حالانکہ وحی ایسا عمل ہے جو پیغمبر کی پوری زندگی کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اس لیے پیغمبر دینی حقائق کی تبیین و تشریح کے ضمن میں جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں، اس میں منشائے الٰہی کی پوری پوری ترجمانی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم: ۳،۴)

اور وہ کوئی بات خواہشِ نفس سے منہ سے نہیں نکالتا، وہ تو وحی الٰہی ہے، جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (احزاب: ۲۱)

تمھارے لیے پیغمبرِ خدا کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

اللہ کی اطاعت اور رسول کی متابعت کو دو مختلف اور متضاد خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو مختلف اظہار یا پرتو ہیں۔ اللہ تعالیٰ کتب و صحائف کے ذریعے معاشرے کے مسائل کا حل نازل فرماتا ہے اور رسول اپنے عمل، کردار اور تشریحات سے وحی و تنزیل ہی کی روشنی میں ان کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ براہِ راست وحی کو علما کی اصطلاح میں وحیِ جلی کہا جاتا ہے اور اسی کی روشنی اور تاثیر کو وحی خفی۔

اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغمبر تو بھیجا گیا ہے مگر اس پر کوئی متعین کتاب نہیں نازل کی گئی، لیکن اس کے باوجود اس کی پیروی کو ضروری ٹھہرایا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر کی ذات بجائے خود حجت و دلیل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے اپنے دور میں کتاب اللہ کی پیروی کے پہلو بہ پہلو اپنی پیروی کی بھی دعوت دی اور لوگوں سے کہا کہ اگر تم نجاتِ اخروی کے طالب

ہو تو ہمارے نقشِ قدم پر چلو۔

حضرت نوح نے فرمایا:

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۞ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۞

(الشعراء: ۱۰۹، ۱۱۰)

میرا صلہ تو خدائے رب العٰلمین ہی پر ہے، تو خدا سے ڈرو، اور میرے کہنے پر چلو۔

حضرت ہود نے کہا:

اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۞ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۞ (الشعراء: ۱۲۶)

مَیں تو تمھارا امانت دار پیغمبر ہوں، تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت صالح کا ارشاد ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۞ (الشعراء: ۱۴۴)

سو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت لوط کا کہنا ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۞ (الشعراء: ۱۶۲)

سو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت شعیب نے اسی پیرایۂ بیان میں بن کے رہنے والوں سے فرمایا:

انّی لکم رسول امین ۞ فاتقوا اللہ و اطیعون ۞ (الشعراء: ۱۷۸، ۱۷۹)

میں تو تمھارا امانت دار پیغمبر ہوں سو خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

حضرت مسیح نے ان الفاظ میں بنی اسرائیل کو اپنی بعثت کے مقصد سے آگاہ کیا:

قد جئتکم بالحکمۃ ولابیّن لکم بعض الذی تختلفون فیہ ج فاتقوا اللہ و اطیعون ۞ (الزخرف: ۶۳)

میں تمھارے پاس دانائی لے کر آیا ہوں- نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف

کر رہے ہو، تم کو سمجھا دوں۔

آئیے! اب یہ دیکھیں کہ ان توجیہات و تصورات کے مقابلے میں قرآن حکیم نے نبوت کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ ہم پوری ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم نے واضح اور غیر مبہم انداز میں اس حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے کہ رسالت و نبوت کا تعلق یکسر فیضانِ ربوبیت سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے کہ عقل و خرد کی وادیوں میں بھٹکتا پھرے، پھر انبیا و رسل کو بھیج کر اس کی رہنمائی کی ہے:

قال ربنا الذی اعطی کل شیء خلقه ثم هدی ○ (طٰہٰ: ۵۰)

(موسیٰ نے) کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی، پھر راہ دکھائی۔

اس لیے کہ انسانی عقل و تجربہ بہر حال محدود و ناقص ہے، اس میں یہ استعداد نہیں پائی جاتی کہ وحی و تنزیل کی روشنی سے بے نیاز رہ کر تہذیب و تمدن کی گتھیوں کو کامیابی سے سلجھا سکے، اور اپنے لیے ایسی راہِ عمل کا تعین کر سکے، جس پر گام فرسا ہو کر یہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر سکے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریق رہا ہے کہ ہر دور میں تسلسل کے ساتھ ایسے اشخاص منتخب کر کے مبعوث فرمائے، جو ذہنی، اخلاقی اور روحانی طور سے اس طرح کامل ہوں اور اس لائق ہوں کہ انسان کو ضلالت اور گمراہی کی پستیوں سے نکال کر رشد و ہدایت کے فرازوں تک پہنچا سکیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

الله اعلم حیث یجعل رسالته ط (الانعام: ۱۲۴)

اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کسے منصبِ نبوت سے نوازے۔

نبوت و رسالت کی ذمے داریاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں تاکہ یہ لوگ خیر و خوبی کے قافلوں کو آگے بڑھا سکیں اور شر و برائی کے قلع قمع کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں۔ اس مضمون کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے، جس سے یہ

بات نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق اللہ کی تدبیر اور نظامِ ربوبیت سے ہے۔ انسانی ماحول، معاشرے، استعداد، یا مجاہدہ ریاضت سے نہیں:

کان الناس امۃ واحدۃ قف فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین ۵ (البقرۃ: ۲۱۲)

پہلے تو سب لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا لیکن وہ آپس میں اختلاف کرنے لگے تو خدا نے ان کی طرف بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے پیغمبر بھیجے۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم (آل عمران)

خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا۔

اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے انبیا کے لیے رسل کا لفظ بھی استعمال کیا ہے:

لقد اخذنا میثاق بنی اسرائیل وارسلنا الیھم رسلاط (المائدہ: ۷۰)

ہم نے بنی اسرائیل سے عہد بھی لیا اور ان کی طرف پیغمبر ارسال کیے۔

آنحضرت کے بارے میں خصوصیت سے ارشاد فرمایا:

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ط و کفی باللہ شھیدا ۵ (الفتح: ۲۸)

وہی ذات تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے اور حق ظاہر کرنے کے لیے خدا ہی کافی ہے۔

اسی نظامِ ربوبیت کی آخری کڑی آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی ہے اور آپ کے فرائض کار میں تین چیزیں داخل ہیں:

۱۔ تعلیم و تبلیغ
۲۔ تزکیہ — اور
۳۔ تبیین

جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہ یک وقت معلم و مبلغ بھی ہیں، اور کتاب اللہ

کے شارح اور مفسر بھی۔ تعلیم و تبلیغ سے مراد یہ ہے کہ آپ امت کو دین کے بنیادی حقائق سے آگاہ کریں، اس کے ذہنی افق کو بلند کریں، اور فکر و نظر کی صلاحیتوں کو اس طرح جلا دیں کہ خدا کی کائنات اور انسان سے متعلق امت ان تمام معلومات سے بہرہ مند ہو سکے، جس پر کہ تہذیب و تمدن کا ارتقا اور تعمیر منحصر ہے۔

تزکیہ سے یہ مقصود ہے کہ آپؐ اپنے روحانی فیوض اور اسوۂ حسنہ سے امت کے اخلاق و کردار کو سنواریں، ان میں انسانی فرائض کا احساس پیدا کریں۔ ہمدردی، محبت اور تعاون و خیر سگالی کے جذبات کی پرورش کریں اور یہ بتائیں کہ انفرادی و اجتماعی سطح پر تقویٰ، پرہیزگاری اور تعلق باللہ کی منزلوں کو کیوں کر کامیابی سے طے کیا جاسکتا ہے۔

تبیین کے معنی یہ ہیں کہ قرآن حکیم میں فرائض و اعمال کے بارے میں جو کچھ بھی مذکور ہے اس کی وضاحت اپنے قول و عمل سے کریں۔ اور جہاں جہاں بھی تشریح طلب اوامر و احکام مذکور ہیں وہاں ان کی تشریح کریں اور امت کو پوری پوری تفصیلات سے آگاہ فرمائیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان پر شب و روز میں کتنی نمازیں فرض ہیں، قیام، رکوع اور سجود میں کیا پڑھنا چاہیے، مناسکِ حج کیا کیا ہیں، نکاح، طلاق اور بیوع یا معاملات سے متعلقہ آیات کا کیا مفہوم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور فرائضِ کار کے بارے میں ہم نے جو تجزیہ پیش کیا ہے اس کی تائید ان آیات سے ہوتی ہے:

کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم اٰیٰتنا ویزکیکم و یعلمکم الکتٰب والحکمۃ ویعلمکم ما لم تکونوا تعلمون ۝ (البقرہ: ۱۵۱)

منجملہ اور نعمتوں کے جس طرح ہم نے تم ہی میں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور تمھیں پاک بناتے اور کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ط (المائدہ: ۶۷)

اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے سب کا سب پہنچا دیجیے۔

یا اھل الکتٰب قد جاءکم رسولنا یبین لکم کثیرا مما کنتم تخفون

من الکتٰب (المائدہ: ۱۵)

اے اہلِ کتاب تمھارے پاس ہمارے پیغمبر آ گئے ہیں کہ جو کچھ تم کتابِ الٰہی میں سے چھپا رکھتے تھے۔ وہ اس میں سے بہت کچھ تمھیں کھول کر بتا دیتے ہیں۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون ٥ (النحل: ۴۳)

اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے تاکہ جو ارشادات لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر کھول کر بیان کر دیں اور تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔

ثم ان علینا بیانہٗ ٥ (القیمٰہ: ۱۹)

پھر اس کے (یعنی قرآن کے) معانی کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے۔

قرآنِ حکیم نے جس طرح تصوّرِ نبوت و رسالت کو نکھارا اور بیان کیا اور جس انداز سے آنحضرتؐ کی اطاعت و اتباع کو ضروری ٹھہرایا، اسی کا یہ نتیجہ اور فیض تھا کہ مسلمانوں نے ہر دَور میں نہ صرف آپؐ کے نقوشِ قدم کی پیروی کی سعادت حاصل کی بلکہ ان نقوش کو اُجاگر بھی کیا، اور ان کی حفاظت و صیانت کا اہتمام بھی کیا۔

سنت کن حقائق سے تعبیر ہے

آنحضرتؐ کے وہ نقوشِ قدم، جن کی پیروی اور اطاعت کا قرآن نے حکم دیا ہے، اور آنحضرتؐ کے وہ ارشادات و اعمال جن کے نتیجہ میں دنیائے انسانیت میں ایک مثالی معاشرہ قائم ہوا۔ فن کی اصطلاح میں سنت کہلاتا ہے۔ لیکن سنت کا ٹھیک ٹھیک اطلاق کن کن معانی پر ہوتا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ لغت، فقہ، حدیث اور اصول کی روشنی میں اس کی وضاحت کی جائے، اور بتایا جائے، کہ مختلف حلقوں میں سنت کا اطلاق کس محل پر ہوا ہے۔

لغت میں سنت کے معنی مطلقاً سیرت یا اس فعل و اقدام کے ہیں۔ جس کی بعد میں آنے والے لوگ پیروی کریں۔ چاہے یہ فعل اچھا ہو یا بُرا۔

نصیب کا ایک شعر ہے:

کانی سننت الحب اول عاشق ۔۔۔ من الناس اذا احببت من بینہم وحدی

جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں رسمِ عشق و محبت کی طرح اوّل اوّل میں نے ہی ڈالی۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے:

من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا و اجر من عمل بھا بعدہ من غیر ان ینقص من اجورھم شیء و من سن فی الاسلام سنۃ سیئۃ کان علیہ وزرھا ووزر من عمل بھا من بعدہ۔

جس نے اسلام میں کسی اچھے طریقِ عمل یا سنتِ حسنہ کو ایجاد کیا، اس کو اپنا اجر بھی ملے گا، اور اس شخص کا بھی جس نے اس طریق کو اپنایا بغیر اس کے کہ ان کے اجر میں کوئی کمی روا رکھی جائے۔

اور جس نے اسلام میں برائی یا سنتِ سیئہ کا بیج بویا، اس کو اپنا بوجھ بھی اٹھانا ہوگا اور اس شخص کا بھی جس نے اس پر عمل کیا۔

گویا سنت کا اطلاق از روئے لغت سیرت اور اسلوب زیست پر ہوتا ہے۔ جس کے لیے یہ ضروری کہ وہ خوب اور بہتر ہی ہو۔ بشرطیکہ اس کے بعد اس انداز اور اسلوب کی تقلید کی جائے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ سنت سننت الابل سے ہو۔ جس کے معنی اونٹوں کو چرانے اور ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے ہیں۔ فقہ میں علماء نے اس کا اطلاق آنحضرت کے ان ارشادات و افعال پر کیا ہے، جو حکمِ شرعی پر دلالت کناں ہوں، یعنی جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ کیا واجب ہے، کیا حرام ہے اور وہ کون سی باتیں ہیں جنھیں ہم مباح یا جائز قرار دے سکتے ہیں۔

علمائے حدیث نے سنت کے اطلاق میں قدرے وسعت سے کام لیا ہے، ان کے نزدیک اس میں آنحضرت کی سیرت، شمائل و عادات، اخلاق اور وہ تمام تر اقوال و افعال شامل ہیں، جو کتب حدیث میں مذکور ہیں، چاہے ان سے کوئی حکم شرعی مستنبط ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ ان کے نقطۂ نظر سے آنحضرت کی حیثیت اس امام و قائد کی ہے جس کی ایک ایک ادا اس لائق ہے کہ ہمارے لیے وہ اسوہ اور نمونہ ہو۔

علماء اصول نے آنحضرت کی ذاتِ گرامی کو اس حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ آپ چونکہ شارع دین ہیں اس لیے آپ کے افعال و اقوال میں سنت کا درجۂ مقام ان اعمال و ارشادات کو بخشا جائے، جن سے مجتہدین کو ان قواعد اور پیمانوں کو وضع کرنے میں مدد مل سکے۔ جو احکام و مسائل پر روشنی ڈال سکیں اور ان کے ذریعہ کسی امر کے درست یا غلط ہونے کے بارہ میں فیصلہ کیا جا سکے۔

سنت کی تین قسمیں ہیں۔ اقوال، افعال اور تقریرات۔

اقوال سے مراد آپ کی وہ باتیں ہیں جو آپ نے مختلف مناسبتوں سے مختلف مقاصد کے اظہار کی غرض سے ارشاد فرمائیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا:

لا وصیۃ لوارث -

کہ وارث کے لیے وصیت کی ضرورت نہیں -

یا یہ کہ کن زمینوں پر عشر واجب ہے، اور کن پر نصف عشر - سمندر سے متعلق فرمایا: ھو الطھور ماءۂ - کہ اس کا پانی پاک ہے -

افعال سے یہ مقصود ہے کہ صحابہ نے آنحضرتؐ کی زندگی اور معمولات کو چوں کہ براہِ راست اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لیے اُمت کو بتایا کہ آپ پانچ نمازیں کیوں کر پڑھتے تھے یا مناسکِ حج کس طرح ادا کرتے تھے - افعال کا دائرہ دراصل آپ کی پوری عملی زندگی کو گھیرے ہوئے ہے -

تقریرات صحابہ کے ان افعال سے تعبیر ہے، جو آپ کے سامنے ہوئے، یا آپ کے علم میں لائے گئے، اور آپ نے یا تو ان کو پسند کیا یا انکار نہ کیا - احادیث میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں - ابو سعید الخدری سے مروی ہے، کہ دو شخص ایک سفر میں شریک ہوئے - دورانِ سفر میں جب نماز کا وقت آیا تو چوں کہ پانی وہاں میسّر نہ تھا، اس لیے دونوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی - پھر جب پانی میسّر آیا تو ان میں ایک شخص نے دوبارہ وضو کیا اور نماز پڑھی - اور دوسرے نے تیمّم ہی پر اکتفا کیا، اور وضو اور نماز کا اعادہ ضروری نہ سمجھا - اس کے بعد جب یہ دونوں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس اختلاف کا ذکر کیا - تو آپؐ نے اس شخص سے کہ جس نے وضو، اور نماز کا اعادہ نہیں کیا تھا، فرمایا: اصبت السنۃ — تو نے ٹھیک طرزِ عمل اختیار کیا ہے اور دوسرے شخص کے بارہ میں، جس نے وضو اور نماز کا اعادہ کیا تھا، اور تیمّم کو کافی نہیں سمجھا تھا - فرمایا:

لک الاجر مرتین —

کہ تم دوہرے اجر کے مستحق ہو -

تقریر ہی کے ضمن میں یہ واقعہ بھی آتا ہے کہ غزوہ بنی قریظہ سے متعلق آپ نے صحابہ سے فرمایا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمھیں عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچ کر ادا

کرنی چاہیے۔ لیکن عصر تک جب یہ حضرات وہاں تک نہ پہنچ پائے تو اُن میں بعض نے تو عصر کی نماز وقت پر پڑھ لی اور بعض نے اسے مابعد المغرب تک مؤخر کر دیا۔ آنحضرتؐ کو جب اس بات کا علم ہوا تو آپ نے دونوں میں سے کسی کے فعل کو غلط نہ ٹھہرایا۔ کیوں کہ اس مسئلہ کا تعلق سراسر اجتہاد سے تھا۔ جن لوگوں نے نماز وقت پر ادا کر لی، انھوں نے یہ خیال کیا کہ آنحضرتؐ کا مقصد یہ ہے کہ بنی قریظہ تک پہنچنے میں تاخیر سے کام نہ لیا جائے۔ نہ یہ کہ جب تک منزلِ مقصود تک نہ پہنچ پائیں نماز ہی نہ پڑھیں۔ اور جن لوگوں نے نماز کو تاخیر سے ادا کیا۔ انھوں نے صرف آنحضرتؐ کے الفاظ کو ملحوظ رکھا۔ اور اس وقت تک عصر کی نماز نہ پڑھی جب تک کہ بنی قریظہ میں نہ پہنچ گئے۔

تقریر کی زیادہ واضح مثال معاذ بن جبل کے بارے میں ملتی ہے۔ آپؐ نے جب ان کو یمن میں والی بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو پوچھا: کیف تصنع ان عرض لک قضاء۔ کہ جب کبھی تصفیہ طلب مسئلہ سے دو چار ہو گے تو اس کو کیوں کر حل کرو گے۔ انھوں نے کہا: کتاب اللہ کی روشنی میں۔ آپ نے فرمایا اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ کی روشنی میں مذکور نہ ہو تو۔ معاذ میں کہا۔ پھر میں اس کو سنت کی ہدایات کے مطابق حل کروں گا۔ اس پر آپ نے استصواب فرمایا۔ اگر تمھیں سنت سے بھی اس سلسلہ میں کوئی مدد نہ ملے۔ تو اس صورت میں تمھارا طرزِ عمل کیا ہو گا۔ اس کا جواب حضرت معاذ نے یہ دیا کہ اس صورت میں اجتہد و لا الو، کہ میں اجتہاد سے کام لوں گا، اور کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔ اس جواب پر آنحضرت اس درجہ خوش ہوئے کہ آپ کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل پڑے: الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی رسول اللہ۔ اس خدا کی حمد و ستائش ہے، کہ جس نے رسول اللہ کے رسول یعنی ان کے بھیجے ہوئے شخص کو یہ توفیق عطا کی، کہ وہ رسول اللہ کی رضا کے موافق اور اس کے حسبِ منشا جواب دے سکے۔

سنت کا اطلاق کبھی کبھی اہلِ علم کے ہاں بدعت کے مقابلہ میں بھی ہوتا ہے لغت میں بدعت کے معنی امر مستحدث کے ہیں۔ اور شرعاً ہر وہ بات بدعت کے دائرہ میں شمار

ہوتی ہے، جو دین و شعائر میں نئی ہو اور آنحضرتؐ یا صحابہ کے طرزِ عمل سے اس کا ثبوت نہ ملتا ہو۔ بدعت سے متعلق حدیث میں ہے:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ ردٌّ۔

کہ جو شخص بھی ہمارے دین میں ایسے اختراع و ایجاد سے کام لیتا ہے جس کا تعلق دین سے نہیں ہے اس کو مسترد کر دینا چاہیے۔

صحابہ کے عمل کو بھی سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بنواجذ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کی پیروی تم پر لازم ہے اس سے تمسک کرو، اور اس کو مضبوطی سے پکڑ لو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ صدر اول میں صحابہ نے جن اجتہادات کی ضرورت محسوس کی۔ جیسے شراب کی حد مقرر کرنا، یا مصاحف کو یک جا ایک جلد میں جمع کرنا۔ یا مصحف کے لیے ایک ہی قرأت کا تعین کرنا وغیرہ امور جو اُن کے عہدِ مبارک میں مصالح دین کے تقاضے کے لیے عمل میں لائے گئے، سنت ہی کے دائرے میں داخل ہیں۔

آنحضرتؐ کے ارشادات، اعمال اور تقریرات جب روایت کے قالب میں ڈھل جائیں تو انھیں لفظ حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی جمع احادیث ہے بعض اوقات حدیث کو لفظ خبر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اہلِ فن کی اصطلاح میں ان دونوں کے استعمال میں فرق یہ ہے کہ حدیث کا اطلاق تو عموماً سنت کی حکایت و روایت ہی پر ہوتا ہے۔ اور خبر کا اطلاق سنت اور اخبار غیر دونوں پر۔ اسی فرق کی وجہ سے ان لوگوں کو محدثین کہا جاتا ہے جو سنت کی حفاظت اور تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں ـــ اور ان لوگوں کو اخباری کے لقب سے پکارا جاتا ہے جو صرف

تاریخ سے تعرض کرتے ہیں۔

اہلِ علم کے حلقوں میں حدیثِ رسول بیان کرنے والوں کو مختلف القاب سے پکارا جاتا ہے۔ جیسے مسند، محدث اور حافظ۔

مسند اس شخص کو کہتے ہیں، جو حدیث کو بقیدِ سند روایت کرے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ فہم و ادراکِ حدیث پر بھی قادر ہو۔

محدث کا درجہ نسبتاً اونچا ہے۔ اس کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ وہ اسانید کو جانے اور متن و اسناد میں جو علل ہیں ان سے بھی آگاہ ہو۔ نیز صحاح ستہ، مسند امام احمد بن حنبل اور سنن بیہقی وغیرہ اہم متونِ سنت سے آشنا ہو۔

حافظ کا مقام ان دونوں سے بلند ہے، اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو نہ صرف سنن سے آگاہ ہو، بلکہ ان مختلف طرق سے بھی واقفیت رکھتا ہو، جن کے ذریعے ان سنن کی روایت ہوتی ہے اور اس کی مرویات اس لائق ہوں کہ فنِ حدیث کے جاننے والے ان کی صحت پر اعتماد کر سکیں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ محدثین نے رواۃ کی جانچ پرکھ کے لیے جو معین اصطلاحیں وضع کر رکھی ہیں ان سے اچھی طرح آشنا ہو۔ نیز ان رواۃ و رجال کے تمام شیوخ کو پہچانتا ہو، اور یہ بھی جانتا ہو کہ متن حدیث کو الفاظ کے جس قالب میں ڈھالا گیا ہے اس کی صحت کا کیا عالم ہے۔

سنّت عہدِ نبویؐ میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں حدیث و سنت کی باقاعدہ تدوین نہیں ہو پائی - اگرچہ یہ مسلمہ امر ہے کہ جہاں تک اس کی حفاظت و صیانت کا تعلق ہے اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی - اسلامی معاشرے میں آنحضرتؐ کے ارشادات و اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونا، ہر مسلمان کے لیے ضروری تھا آپ کی اطاعت فرض تھی، اس لیے اس بارے میں دو رائیں نہیں پائی جاتیں کہ آپ کا ہر قول و عمل دین کی تشریح و تفسیر پر مبنی ہے - بلکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ اگر دین کے دائرے سے آپؐ کی تعلیمات کو خارج کر دیا جائے تو سرے سے دین کی کوئی عملی شکل ہی متعین نہیں ہو پاتی، اور کسی طرح یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ قرآنِ حکیم نے جن اخلاقی و روحانی اقدار کی تعلیم دی ہے ان سے کس طرح کی زندگی متشکل ہوتی ہے اور کس نوع کا معاشرہ معرضِ وجود میں آتا ہے - یہ آنحضرتؐ کے فیضانِ تعلیم و تربیت ہی کا کرشمہ ہے کہ قرآن حکیم ایک کامل نمونے کے قالب میں ڈھلا، اور نوعِ انسانی کے لیے صحیح معنوں میں ایک رہبر اور راہ نما کی صورت میں اُبھر کر سامنے آیا - لہٰذا جہاں تک آپؐ کے اعمال و ارشادات کا تعلق ہے، یہ کہنا متفقہ طور سے اسلامی شعور کی ترجمانی کرنے کے مترادف ہے کہ دین کی تشریح و تفسیر کے سلسلے میں قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ یہ دوسرا ماخذ اور سرچشمہ ہے جو اپنی آغوش میں حجیت و استناد کی روشن اور اعلیٰ مثالیں لیے ہوئے ہے - یہی وجہ کہ صحابہ نے نہ صرف آنحضرتؐ کے نقوشِ قدم کی پیروی کو سعادتِ اُخروی کا توشہ جانا بلکہ اپنے سینوں کو اس کی ضوفشانیوں سے منور بھی رکھا اور اس کی حفاظت کے لیے جو ذرائع ممکن اور اسلامی مصالح کے موافق تھے، ان کو اختیار بھی کیا -

اس مرحلے پر یہ سوال یقیناً ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ احادیث وسنن کو اگر یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ دین کا ماخذ و مبنیٰ ہیں تو پھر ضروری تھا کہ قرآن حکیم کی طرح اس کی بھی عصرِ نبوت میں ہی باقاعدہ تدوین ہو جاتی۔ یہ تدوین کیوں نہیں ہو پائی؟ اس کی ایک توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آنحضرتؐ جس وقت منصبِ نبوت سے سرفراز ہوئے اس وقت مکہ مکرمہ میں دس سے کچھ ہی زائد افراد ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ عام مؤرخین بھی یہی کہتے چلے آرہے ہیں کہ:

کانت الکتابۃ فی العرب قلیلۃ۔

عربوں میں اس دور میں لکھنے کا رواج کم تھا

ہم مستشرقین کے اس دعوے کی تائید کے حق میں نہیں ہیں کہ آنحضرتؐ جس قوم میں مبعوث ہوئے وہ اچھی خاصی لکھی پڑھی قوم تھی اور اُن کی اکثریت قرأت و کتابت کے اصولوں سے بخوبی آشنا تھی اور یہ کہ قرآن میں جو اُن کو اور آنحضرتؐ کو 'اُمّی' کہا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ شریعتِ الٰہیہ سے ناواقف تھے۔ اُمّی کی یہ تشریح لغت، تاریخ اور قرآن کے صریحاً خلاف ہے۔ جمہور مفسرین کا یہی عقیدہ ہے اور صحیح ہے کہ عربوں کی اکثریت نہ صرف اُمّی تھی بلکہ اس کو اپنی اُمیّت پر فخر و ناز بھی تھا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے حافظے اس درجہ قوی اور مضبوط ہیں کہ ایک دفعہ وہ جس چیز کو سن لیں اور اپنی گرفت میں لے لیں وہ ہمیشہ کے لیے ان کی لوحِ ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ان کا خیال تھا کہ کتابت میں تغیر و تبدل کا برابر احتمال رہتا ہے۔ یہی نہیں کتاب ضائع بھی ہو سکتی ہے، لیکن قلب و ذہن پر کندہ نقوش نہ ضائع ہوتے ہیں اور نہ ان میں تحریف و تصحیف ہی کی گنجائش رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے وہ حفظ کو کتابت پر ترجیح دیتے تھے۔

ہم جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اگرچہ ان کی اکثریت جاہل تھی

تاہم ان میں فنِ کتابت سے آشنا افراد کی تعداد اتنی کم نہ تھی جتنی کہ عام طور سے بیان کی جاتی ہے۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے مکہ مکرمہ نہ صرف ایک معبد کی حیثیت سے مشہور تھا بلکہ کاروبار اور تجارت کا بہت بڑا مرکز بھی تھا اور یہ بات قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ کاروباری طبقہ، تحریر و کتابت کی صلاحیتوں سے یکسر محروم ہو یا اس کی ضرورت و اہمیت سے قطعی ناواقف ہو، مکہ والے فنِ کتابت سے بہرہ مند تھے، اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ غزوۂ بدر میں جو لوگ اسیر ہو کر آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ان کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ ان میں کا ہر ایک فرد مدینہ کے بچوں کو کتابت و قرأت کی تعلیم دے۔ مزید برآں کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ لوگ جن کو کاتبِ وحی کے پُر افتخار لقب سے نوازا جاتا ہے جو تعداد میں چالیس سے کم نہیں تھے، ان میں اکثریت ان اصحاب ہی کی تھی جن کا تعلق مکہ مکرمہ سے تھا۔

ورقہ بن نوفل مکہ ہی کا رہنے والا تھا۔ اس نے زمانۂ جاہلیت میں تورات اور انجیل کو عربی تحریر میں منتقل کیا۔ زمانۂ جاہلیت میں عربی میں لکھنے پڑھنے کا رواج تھا۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قرآنِ حکیم میں ان تمام لوازم کا ذکر ہے جو لکھنے پڑھنے سے متعلق ہیں۔ مثلاً قرطاس:

تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ۔ (الانعام: ۹۱)

جسے تم نے علیحدہ اوراق پر نقل کر رکھا ہے۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿۱﴾ (القلم: ۱)

قسم ہے قلم کی اور جو اہلِ قلم لکھنے والے ہیں۔ ان کی قسم۔

سیاہی

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

کہہ دیجیے، اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی ہوں تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں، سمندر ختم ہو جائے۔ اگرچہ ہم ویسا ہی اور سمندر اس کی مدد کو لائیں۔

اسی طرح اور الفاظ بھی قرآن میں مذکور ہیں، جن سے مکہ والوں کی تحریری صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے۔ جیسے مرقوم، مسطور، سفرہ، کاتب اسفار، زبر، صحف، سجل وغیرہ۔

مدینہ منورہ میں تشریف لے جا کر آنحضرتؐ نے تعلیم و تعلم کی طرف زیادہ توجہ مبذول فرمائی اور اس طرح لکھنے پڑھنے کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ اس دور میں مساجد علم کا مرکز تھیں اور مدینہ میں نو مسجدیں تھیں، جہاں مختلف قبائل کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ خصوصیت سے مسجد نبویؐ میں ایک مقام جسے "صفہ" کہا جاتا ہے، تعلیم کا بہت بڑا مرکز تھا، یہاں صحابہ صبح و شام تحصیل علم میں مشغول رہتے۔ عبداللہ بن سعید بن العاص انھیں لکھنا پڑھنا سکھاتے، جو اس فن کی باریکیوں سے اچھی طرح آگاہ تھے، اور آنحضرتؐ نے خود انھیں اس کام کے لیے مامور فرمایا تھا۔ اہلِ علم اس حقیقت سے بھی نا آشنا نہ ہوں گے کہ پہلی ہجری میں آنحضرتؐ نے مردم شماری کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ مدینے میں تمام ان بسنے والوں کی تعداد معلوم کی جائے، جو آغوشِ اسلام میں آ چکے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں باب کتابۃ الامام للناس کے تحت اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اس مردم شماری میں ایک ہزار پانچ صد مسلمانوں کے نام درج کیے گئے۔

اس تجزیہ سے یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ آنحضرتؐ کے عہدِ مبارک میں جو احادیث و سنن کی باقاعدہ اور رسمی تدوین نہیں ہو پائی تو اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ صحابہ میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم تھے، بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اس دور میں آنحضرتؐ اور صحابہ کے سامنے اہم مسئلہ یہ تھا کہ تحریر کی صورت میں کہیں احادیثِ رسول اور قرآن کی آیات میں اختلاط نہ ہونے پائے، اور ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی توجہ

حفظِ قرآن کی طرف سے ہٹ جائے۔ اسی اندیشے کے پیش نظر ابتدا میں آنحضرتؐ نے کتابت سے یہ کہہ کر روک دیا:

لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ، وحدثوا عنی ولا حرج۔

کہ تم احادیث کو قلم بند نہ کرو، اور جس نے قرآن کے سوا کچھ لکھ رکھا ہے، وہ اس کو مٹا دے۔ ہاں احادیث کو بیان کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ حدیث ابو سعید الخدری سے مروی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیثِ رسول بیان بھی کی جائے اور اس کے انوار سے سینوں کو فروزاں بھی رکھا جائے، لیکن اسے معرضِ تحریر میں نہ لایا جائے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ احادیثِ رسول اور آیاتِ قرآن میں خطِ امتیاز نہ کھینچ سکیں۔ لیکن جب قرآنِ حکیم ہر طرح محفوظ ہو گیا، صدور میں بھی اور سطور میں بھی، اور التباس و اختلاط کا اندیشہ جاتا رہا تو آنحضرتؐ نے کتابتِ احادیث کی اجازت دے دی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

قیدوا العلم بالکتاب۔

علم کو قیدِ تحریر میں لے آؤ۔

رافع بن خدیج سے مروی ہے:

انہ قال! قلت یارسول اللہ! انا نسمع عنک اشیاء افنکتبھا، قال اکتبوا ولا حرج۔

رافع بن خدیج نے کہا یارسول اللہ! ہم آپ سے بہت سی باتوں کو سنتے ہیں، کیا ہم انھیں لکھ لیا کریں۔ آپ نے فرمایا لکھ لیا کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔

سنن ترمذی میں ابوہریرہ سے یہ روایت منقول ہے کہ ایک انصاری آنحضرتؐ کی مجلس میں بیٹھتا اور آنحضرتؐ کے ارشادات کو سنتا اور استفادہ کرتا۔ لیکن اس کا حافظہ اس درجہ قوی نہ تھا کہ ان کو قیدِ حفظ میں لا سکے۔ اس لیے آنحضرتؐ سے اس نے اپنی اس کمزوری کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا:

استعن بیمینك

اپنے داہنے ہاتھ سے کام لو

یعنی اگر تمھیں احادیث یاد نہیں رہتیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ لکھ لیا کرو۔

فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے ایک طویل اور حکیمانہ خطبہ ارشاد فرمایا جس کو اسلام کا دستورِ حیات کہا جا سکتا ہے۔ آپ جب خطبے سے فارغ ہوئے، تو یمن کے ایک صاحب ابوشاہ نامی شخص کھڑے ہوئے اور گزارش کی کہ یا رسول اللہ! مجھے یہ خطبہ لکھوا دیجیے۔ اس پر آپؐ نے یہ حکم دیا:

اکتبوا لابی شاہ۔

کہ ابی شاہ کے لیے یہ خطبہ لکھ دو۔

ان تصریحات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آپ نے کتابتِ حدیث سے ابتداءً اگرچہ اس خطرے کی بنا پر روکا تھا کہ احادیث اور قرآن کی آیات میں التباس و اختلاط نہ پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ نہی عام اور مطلق نہ تھی بلکہ ایک مصلحتِ دینی کے تابع تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ قرآنِ حکیم کی آیات میں کوئی اشتباہ نہ پیدا ہو، چنانچہ جب یہ اشتباہ اور خطرہ دور ہو گیا اور قرآن کی حفاظت و صیانت کے تمام مرحلے طے ہو گئے تو آپؐ نے اس کی اجازت مرحمت فرما دی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زندگی ہی میں احادیث کے متعدد مجموعے تیار ہو گئے، جن میں مشہور یہ ہیں:

۱۔ سعد بن عبادہ الانصاری کا صحیفہ۔

۲۔ سمرہ بن جندب کا رسالہ: اس کے بارے میں ابن سیرین کا کہنا ہے کہ اس میں علم کثیر حصہ مذکور ہے۔

۳۔ جابر بن عبداللہ کا صحیفہ: اس کی قدر و قیمت سے متعلق جلیل القدر تابعی قتادہ بن السدوسی کا کہنا ہے:

لان صحیفۃ جابر احفظ منی من سورۃ البقرۃ۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے ذہن میں سورۃ بقرہ اس قدر محفوظ نہیں، جس قدر یہ صحیفہ محفوظ ہے۔

۴۔ الصحیفۃ الصادقہ: اس کو عبداللہ بن عمرو بن العاص نے آنحضرتؐ سے سُن کر لکھا۔ مسند احمد میں اس صحیفے کے مشمولات کا ذکر موجود ہے۔ اس میں اس بات کی تصریح بھی پائی جاتی ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا، کہ کیا آپؐ جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں، میں لکھ لیا کروں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، ہاں لکھ لیا کرو۔ اس نے پھر پوچھا، کیا رضا اور غضب دونوں حالتوں میں۔ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

نعم فانی لا اقول فی ذٰلک الا حقا۔

کیوں نہیں میں دونوں صورتوں میں حق ہی کا اظہار کرتا ہوں۔

۵۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا اور عظیم الشان صحیفہ وہ ہے جس میں آنحضرتؐ نے مہاجرین و انصار اور یہود کے مابین حقوق و فرائض کی تعیین کی، اور ایک معاہدے کی شکل میں ترتیب دیا۔ اس میں پانچ مرتبہ اہل ھٰذہ الصحیفۃ کا لفظ آیا ہے۔ یہ صحیفہ صحابہ میں اس درجہ مشہور و متواتر تھا کہ کتاب اللہ کے پہلو بہ پہلو اس کا ذکر کیا جاتا۔ اس میں اسلام کے کلیات و احکام کی ایسی تشریح پائی جاتی ہے جس کی بنیاد پر مدینہ میں پہلی اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ آپ کے پاس کوئی مخصوص تحریر یا کتاب موجود ہے۔ آپ نے فرمایا:

لا، الا کتاب اللہ او فہم اعطیہ رجل مسلم وما فی ھٰذہ الصحیفۃ۔

نہیں، سوا کتاب اللہ اور اس فہم و ادراک کے جس سے ہر مسلمان بہرہ مند ہے، یا جو اس صحیفہ میں مندرج ہے۔

۶۔ صحف ابن عباس: ان صحف کی کتابت ان کے شاگرد سعید بن جبیر نے کی، ان کی مرویات اس درجہ مشہور ہیں کہ اس سے تفاسیر و احادیث کے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

۷۔ صحیفۂ ابی ہریرہ: حضرت ابی ہریرہ کثیر الروایۃ ہیں۔ ان کی مرویات کا مجموعہ وہ ہے جس کی ان کے تلمیذ رشید ہمام بن منبہ نے روایت کی۔ یہ اگرچہ تابعی ہیں تاہم اس میں مذکورہ روایات چونکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں، اس لیے اس صحیفے کو بھی ہم ان صحائف میں شمار کر سکتے ہیں جو عہدِ نبوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی دریافت کا شرف ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایسے فاضل و محقق کو حاصل ہوا جنھوں نے برلن اور دمشق کی لائبریریوں میں سے اسے ڈھونڈ نکالا۔ تدوینِ حدیث میں یہ صحیفہ بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اس کی توثیق اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ یہ صحیفہ جوں کا توں مسندِ احمد میں مندرج ہے۔ صحیح بخاری کے ابواب میں بھی اس کی مرویات پائی جاتی ہیں۔ یہ ۱۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۸۔ مکتوبات: عہدِ نبوی میں اس دور کے متعدد حکمرانوں کو جو خطوط لکھے گئے، وہ بھی کتابتِ حدیث کے سلسلۃ الذہب کی ایک درخشاں کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ان کو اسلام کی دعوت دی گئی اور ان پر واضح کیا گیا کہ اگر یہ امرا و سلاطین دنیا و آخرت میں سلامتی کے خواہاں ہیں تو انھیں چاہیے کہ اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر لیں۔

آنحضرتؐ کا اسلوبِ دعوت و ارشاد

آنحضرتؐ نے جس طرح کہ قرآن حکیم بتدریج نازل ہوتا رہا، اسی طرح تعلیم و ارشاد میں بھی تدریج سے کام لیا اور تئیس برسوں میں برابر لوگوں تک اس کے پیغام کو پہنچاتے رہے۔ یہی نہیں، آپ نے عملاً امت کی باقاعدہ تربیت کی، اُن کے اخلاق کو سنوارا، عبادات و رسوم کی اصلاح کی اور ان تمام باتوں کی تشریح و وضاحت کی جن کا تعلق انسان کی انفرادی، اجتماعی اور سیاسی و روحانی زندگی سے ہوسکتا ہے۔ آپ اٹھتے، بیٹھتے، سفر و حضر، صلح و جنگ، ہر حالت میں قرآن حکیم کی عملی تطبیق میں کوشاں رہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن حکیم کے ساتھ احادیث و سنن کا ذخیرہ بھی جمع ہوتا رہا اور ترتیب پاتا رہا۔

اوّل اوّل آپ نے دارالارقم کو تعلیم و ارشاد کا مرکز قرار دیا۔ اس کے بعد مسجد کو یہ اہمیت حاصل ہوئی کہ یہاں ہر نوع کے معاملات طے کیے جاتیں اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جاتے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کی مبلغانہ کوششیں صرف مساجد ہی تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ آپ کو جب بھی اور جہاں بھی احکام کی تشریح و توضیح کا موقع میسر آتا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے اور مناسب ہدایات دیتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے:

انما کانوا اذا صلوا الغداۃ قعدوا حلقا حلقا یقرءون القرآن ویتعلمون الفرائض والسنن۔

صحابہ کی یہ عادت تھی کہ صبح کی نماز کے بعد مختلف حلقوں اور دائروں میں منقسم ہو جاتے اور اپنے اپنے حلقے اور دائرے میں قرآن پڑھتے، اور آنحضرتؐ سے فرائض و سنن کی تعلیم حاصل کرتے۔

جس کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرتؐ صحابہ کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ایسی علمی مجالس کا اہتمام بھی فرماتے جن سے استفادہ کر کے اس لائق ہو جاتے کہ اپنی زندگیوں کو اسلام کے عملی سانچوں میں ڈھال سکیں۔ ان علمی مجالس میں عورتوں کو بھی شریک کیا جاتا، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آپ نے ان کے لیے خود ان کی خواہش پر ایک مقام اور وقت کا تعین فرمایا اور کہا کہ تم فلاں گھر پہنچ جاؤ، مَیں بھی وہاں آجاؤں گا۔ چنانچہ آپ وقت مقررہ پر تشریف لائے اور ان کو وعظ و نصیحت سے نوازا۔

آپ کے اندازِ وعظ و نصیحت کی کچھ خصوصیات تھیں۔ مثلاً یہ کہ:

۱۔ آپ اس بات کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے کہ صحابہ کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں مناسب اوقات کا انتظار کیا جائے۔ اور یہ دیکھا جائے کہ کب اور کس وقت یہ نصائح کو صدق دل سے قبول کر سکتے ہیں۔

ابن مسعود کا کہنا ہے:

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخوّلنا بالموعظۃ فی الایام کراھیۃ السّامۃ علینا۔

یعنی آنحضرت وعظ و ارشاد میں تخول سے کام لیتے، تاکہ روزانہ اور ہر وقت کی نصیحت سے طبائع اکتا نہ جائیں۔

تعلیم و تربیت کا یہ ایسا انداز ہے جس کی اہمیت و افادیت کو اس دور کے بہت سے تربیتی اداروں نے اپنا لیا ہے اور اس حقیقت کو مان لیا ہے کہ تعلیم اسی وقت صحیح نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جب طلبہ کی نفسیات کا خاص رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ کب اور کس وقت ان کا ذہن و قلب حاضر ہے، اور اس لائق ہے کہ تعلیم و تربیت کے اصولوں سے صحیح معنوں میں بہرہ مند ہو سکے۔

۲۔ ہر شخص کی ذہنی سطح اور مدارج عقلی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کا قاعدہ تھا کہ وہ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں ہر شخص کی ذہنی سطح اور اس کے مدارج عقلی

کا پورا پورا خیال رکھتے۔ حضری اور شہری لوگوں سے ان کے انداز و معیار کے مطابق گفتگو فرماتے، اور بدوی سے اس کی ذہنیت کے مطابق بات کرتے۔ اس کی بہترین مثال ابو ہریرہ کی اس روایت سے ملے گی، جس میں بنی فزارۃ کے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بدوی تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے، جو سیاہ رنگ کا ہے۔ میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ ہم میاں بیوی میں کوئی بھی سیاہ رنگ کا نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے اس کی سمجھ اور پیشہ کے مطابق جواب مرحمت فرمایا۔ اس سے پوچھا:

هل لك من إبل۔

کیا تمھارے پاس کچھ اونٹ ہیں؟

اس نے کہا۔ جی ہاں۔ آپ نے پھر دریافت فرمایا۔ وہ کس رنگ کے ہیں، اس نے کہا، سرخ رنگ کے۔ آپ نے اس پر سوال کیا کہ کیا ان میں کوئی اورق یعنی خاکستری رنگ کا یا کم سیاہ رنگ کا کوئی اونٹ بھی ہے؟ اس نے کہا، ہاں ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ سرخ رنگ کے اونٹوں میں یہ سیاہی کیسے آگھسی۔ اس نے اس کے جواب میں کہا۔ ممکن ہے۔ اس کے نسب میں کوئی اونٹ خاکستری یا سیاہ رنگ کا ہو۔ اور اس کی جھلک ہو۔ جب بات یہاں تک پہنچ چکی تو آپ نے یہ کہہ کر اس کے شبہے کو دور کر دیا:

وهٰذا عسٰی ان یکون نزعة عرق۔

کہ یہاں بھی معاملہ ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ نسب کا کرشمہ کارفرما ہو اور اس میں تمھاری بیوی کا کوئی قصور نہ ہو۔

طبرانی کی روایت ہے کہ قریش کا ایک نوجوان جو حیوانیت کے جذبات سے مغلوب تھا۔ آنحضرتؐ کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا کہ مجھے زنا کی اجازت مرحمت فرما دیجیے۔ اس کا کہنا تھا کہ حاضرین اس پر لپکے اور اس گستاخی پر اس کو خوب

ڈانٹا ڈپٹا۔ آپ نے یہ دیکھا تو فرمایا۔ اس سے تعرض نہ کرو۔ اس کو اپنے قریب بلا کر پوچھا :

اتحبہٗ لامک ۔

کیا تم اسے اپنی ماں کے لیے پسند کرو گے ؟

اس نے کہا ۔ بخدا ، ایسا نہیں ہو سکتا ۔

اس پر آپ نے کہا ، تو کیا تم چاہو گے کہ تمھاری بیٹی کے ساتھ کوئی شخص یہ سلوک روا رکھے ۔ اس نے جواب میں بھی کہا کہ جی نہیں ، میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتا ۔ اسی طرح آپ نے اس کی دیگر رشتے دار خواتین کا ایک ایک کر کے ذکر کیا اور پوچھا ، کہ کیا تم پسند کرو گے کہ ان سے یہ معاملہ روا رکھا جائے ۔ اس نے ہر سوال کے جواب میں یہی رویہ اختیار کیے رکھا اور کہا کہ ہرگز نہیں ۔ اس کے بعد آپ نے اس کی مغفرت کی دعا کی ۔ راوی کا کہنا ہے کہ تفہیم و تعلیم کے اس انداز سے یہ اس درجہ متاثر ہو کہ اس کے بعد یہ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا ، اور پھر کبھی اس گناہ کی طرف ملتفت نہ ہوا ۔

۳ ۔ آپ کی عادت مبارکہ کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ آپ جب بھی اپنے صحابہ کو کوئی دینی حکم سمجھانا چاہتے تو اس کو تین تین مرتبہ دہراتے ، تاکہ بات نہ صرف دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے بلکہ لوحِ قلب پر مرتسم بھی ہو جائے ۔

انس بن مالک سے روایت ہے :

ان النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثا حتیٰ تفھم منہ ۔

آنحضرتؐ جب کچھ ارشاد فرمانا چاہتے ، تو ہر ایک کلمہ کا تین تین دفعہ اعادہ کرتے ۔ تاکہ سننے والا ۔ اچھی طرح فہم و ادراک کی گرفت میں لے آئے ۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ آپ کا دائمی معمول تھا ۔ آپ موقع اور مناسبت کا خیال رکھتے اور اسی انداز میں گفتگو فرماتے ، جو مقام و محل کے موافق ہو ۔

۴ ۔ آسانی اور تیسیر بھی ایک اصول تھا ، جس کو آنحضرت احکام و عبادات

میں خصوصیت سے ملحوظ ومرعی رکھتے اور لوگوں کو اس بات سے باز رکھتے کہ احکام و مسائل میں تضییق یا تنگی سے کام لیں، یا عبادات میں تصنع اور سختی کو اپنائیں۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

عَلِّمُوا ویسروا ولا تعسروا۔

لوگوں کو تعلیم دو، اور آسانی پیدا کرو اور مشکلات سے پرہیز کرو۔

حضرت انس سے مروی ہے:

خیر دینکم الیسر وخیر العبادۃ الفقہ۔

تمھارے دین میں کا وہ حصہ بہتر ہے جو زیادہ آسان اور سہل ہو، اور بہترین عبادت احکام کی سمجھ بوجھ ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ اغلوطات سے منع فرمایا کرتے تھے۔ امام اوزاعی کا کہنا ہے کہ اس سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے مشکل اور پیچیدہ مسائل نہ بیان کیے جائیں، جن سے وہ کچھ بھی اخذ نہ کر سکیں۔ بلکہ صرف وہی باتیں بیان کی جائیں جن کو وہ آسانی سے سمجھ بوجھ سکیں۔

۵۔ آنحضرتؐ گفتگو میں سامع کے لب ولہجہ کا بھی خیال رکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ اس کا تعلق کس قبیلے سے ہے اور اس قبیلے میں کس نوعیت کی زبان رائج ہے۔

خطیب بغدادی نے عاصم الاشعری سے روایت کی ہے کہ آپ نے اس کو مخاطب فرمایا:

لیس من امبر امصیام فی امسفر اس میں اشعریین کی اس عادت کو ملحوظ رکھا کہ یہ اکثر لام کو میم کے ساتھ بدل دیتے ہیں۔ اس کو فصیح عربی میں اگر ادا کریں تو یوں کہا جا سکتا ہے:

لیس من البر الصیام فی السفر۔ کہ سفر کے دوران روزہ رکھنا نیکی نہیں۔

اس طرزِ تخاطب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اگرچہ افصح العرب تھے۔ اور فصیح ترین زبان میں گفتگو فرماتے تھے، تاہم تیسیر، آسانی اور تفہیم کو ہر شئی سے مقدم جانتے تھے۔

صحابہ اور تابعین کے دور میں علمِ حدیث کی اشاعت کا جذبہ

تاریخ و احادیث کے سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد آپ کی اُمت نے آپ کی تعلیمات کی اشاعت و فروغ میں کس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کس جانفشانی اور شوق و محبت سے شمعِ نبوّت کی کرنوں کو اپنے دامنِ عمل میں سمیٹا اور اس کی روشنی سے قلب و ذہن کے اجالوں کا سامان مہیا کیا۔ دینی نقطہ نظر سے دیکھیے تو صحابہ اور تابعین کے لیے اس سے زیادہ اور کون شئی عزیز ہو سکتی تھی کہ وہ نہ صرف آنحضرتؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کریں بلکہ اس اسوہ حسنہ کی ایک ایک ادا اور جھلک کو دیکھیں اور اس کو دوسروں تک پہنچائیں۔ یہی وجہ ہے آنحضرتؐ کے بعد اشاعتِ سنت کے جذبہ نے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ ہر شخص کے دل میں اس داعیہ نے کروٹ لی کہ آپ کے ارشادات و معمولات کو معلوم کیا جائے، کیونکہ آنحضرتؐ کی سیرت، سنن اور منہاجِ زندگی کو تفصیل سے جانے بنا ان اصولوں کو ایک مکمل نظام کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جا سکتا، جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ ہی کو دیکھیے۔ یہ براءؓ کے والد جناب عازب کے ہاں پہنچتے ہیں اور اپنی اونٹنی کے لیے کچھ سامان خریدتے ہیں اور کہتے ہیں کہ براءؓ سے کہیے کہ مجھے یہ میرے گھر تک پہنچا دیں۔ اس پر وہ کہتے ہیں کہ یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک آپ یہ نہ بتا دیں کہ آنحضرتؐ نے جب مکہ سے ہجرت کی تو آپ نے کس طرح آپؐ کا ساتھ دیا، تب آپ نے اس کو ہجرت کا پورا واقعہ سنایا۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ آپ کعب لاحبار سے ملے، ان سے پوچھا، کیا آپ کو کوئی ایسی حدیث یاد ہے جو "منجیات" کے بارے میں ہو۔ یعنی ایسے اعمال کے بارے میں، جو فتنہ وابتلا سے نجات دلانے کی ضامن ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں۔ مجھے جو حدیث اس سلسلے میں یاد ہے وہ "موبقات" سے متعلق ہے۔ موبقات وہ اعمال ہیں جو ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔

کعب نے کہا، اچھا یوں ہی سہی۔ پہلے آپ حدیث کی روشنی میں موبقات کی تشریح کیجیے۔ اس کے بعد "منجیات" کی نشان دہی کروں گا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ میں نے آنحضرتؐ سے سنا ہے:

الموبقات، ترك السنة، ونكث البيعة وفراق الجماعة۔

ہلاکت میں ڈالنے والی تین چیزیں ہیں۔ ترک سنت، نقض بیعت اور جماعت سے علیحدگی اختیار کر لینا۔

کعب نے "منجیات" کے بارے میں یہ حدیث بیان کی:

كف لسانك وجلوس فى بيتك وبكاءك على خطيئتك۔

زبان کو بے جا استعمال سے روکے رکھنا۔ فتنہ وابتلا کے دور میں بیٹھے رہنا، اور اپنے گناہوں پر نادم ہونا اور رونا۔

میراث کے بارے میں انبیا کا کیا کردار ہوتا ہے اور مال و دولت سے متعلق ان کی کیا روش ہوتی ہے۔ اس اہم مسئلے پر حضرت عمرؓ فاروق نے اس حدیث کے ذریعے روشنی ڈالی۔

لا نورث ما تركناه صدقة۔

ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔

حضرت عثمانؓ سے حضرت عمرؓ کی وساطت سے روایت ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:

انى لا علم كلمة لا يقولها عبد حقا الا حرم على النار! لا اله

الا اللہ۔

میں ایک ایسی بات جانتا ہوں کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس کا دل سے اقرار کرے تو اس پر جہنم کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ وہ بات لا الہ الا اللہ ہے۔

عبدالرحمٰن بن عوف کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا:

رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و رجمنا بعدہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا دی، اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کی سزا کو برقرار رکھا۔

بجالۃ بن عبدہ سے مروی ہے کہ میں مناذر میں جریر بن معاویہ کا کاتب تھا ہمیں یہاں حضرت فاروق کی طرف سے ایک مکتوب موصول ہوا۔ جس میں اس امر کی تصریح تھی کہ جزیہ کے معاملہ میں مجوس ہجر کو ذہن میں رکھو اور ان پر جزیہ عائد کرو، کیونکہ عبدالرحمٰن بن عوف کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ نے مجوس ہجر سے جزیہ لیا۔

گویا صحابہ اس عہد میں نہ صرف آنحضرت سے براہِ راست حدیث کی روایت کرتے تھے بلکہ ان کے ہاں ایک دوسرے سے روایت کرنے کا سلسلہ بھی رائج تھا۔ چنانچہ کتب سنن میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ جیسے حضرتؓ عائشہ نے حضرت صدیق سے روایت کی اور حضرت صدیق نے حضرت عائشہ سے۔ ابنِ عمر نے ابن عباس سے روایت کی اور ابنِ عباس نے عبداللہ بن عمر سے۔

صحابہ رضوان علیہم اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے کہ ایک دوسرے سے احادیث سُنیں اور ان کو دوسروں تک پہنچائیں۔ بلکہ وہ تابعین یا اپنے تلامذہ کو اس بات کی خصوصیت سے تلقین بھی کرتے تھے کہ وہ اہلِ علم کی مجالس میں شریک ہوا کریں اور ان کے علم و عرفان سے استفادہ کیا کریں۔

فتح الباری میں حضرت عمر کا یہ قول منقول ہے:

تعلموا الفرائض والسنۃ کما تعلّمون القرآن

فرائض اور سنت کی اسی طرح تعلیم حاصل کرو جس طرح تم قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہو۔

حضرت ابوذر نے فرمایا :

لو وضعتم الصمصامة علی ھذہ و اشار الی قفاہ ثم ظننت انی انفذ کلمة سمعتھا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل ان تجیزوا علی لانفذتھا۔

اگر تم تلوار میری گردن پر رکھ دو اور مجھے یہ خیال ہو کہ میں وہ بات تمھیں بتانے والا ہوں جو میں نے آنحضرت سے سُنی تو قبل اس کے کہ تلوار میرا کام تمام کردے میں وہ بات کہہ گزروں گا۔

ابی قلابہ کا کہنا ہے :

علیکم بالعلم قبل ان یقبض، وقبضہ ذھاب اھلہ۔

علم کا التزام کرو، اس سے پہلے کہ علم قبض کر لیا جائے، اور علم کا قبض کرنا اہلِ علم کا اس دنیا سے اُٹھ جانا ہے۔

ان کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ بدعات کے ارتکاب سے لوگوں کو روکتے تھے اور اشاعتِ سنت میں برابر کوشاں رہتے تھے، ان کا یہ قول کس درجہ حکمت پر مبنی ہے :

الاقتصاد فی السنة افضل من الاجتھاد فی البدعة۔

سنت میں میانہ روی اس اجتہاد سے بہتر ہے، جو بدعت کا موجب ہو۔

عمرو بن العاص نے قریش کے ایک حلقہ کو مخاطب کر کے کہا :

مالکم قد طرحتم ھذہ الاغلیمة لا تفعلوا اوسعوا لھم فی المجلس واسمعوھم الحدیث وافھموھم ایاہ فانھم صغار قوم اوشک ان یکونوا کبار قوم، وقد کنتم صغار قوم فانتم الیوم کبار قوم۔

تم نے ان کم عمر لڑکوں کو کیوں نظر انداز کر رکھا ہے۔ ایسا نہ کرو، ان کے لیے مجالس میں وسعت پیدا کرو اور انھیں حدیث کا درس دو اور اس کا مفہوم بتاؤ۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ کم عمر ہیں، لیکن کل یہ قوم کے بڑوں میں شمار ہوں گے، اور تم بھی پہلے کم عمر تھے لیکن آج قوم میں بڑے ہو۔

حضرت ابنِ عباس اپنے تلامذہ کو مذاکرۂ حدیث پر ہمیشہ یہ کہہ کر آمادہ کیا کرتے تھے :

تذاکروا ھذا الحدیث لا ینفلت منکم۔

اس حدیث کا مذاکرہ جاری رکھو تاکہ یہ ذہن کی گرفت سے نکل نہ جائے۔

اس طرح صحابہ نے اشاعتِ سنت کے قافلے کو آگے بڑھایا اور ان کے بعد تابعین نے ان کے نقشِ قدم کی پیروی کی، اور اسی شوق، جذبہ اور ولولہ سے سرشار ہوکر احادیث وسنن کی روشنی کو آئندہ نسلوں تک پہنچایا۔

احادیث کی تدریس واشاعت ان کا مطمح نظر تھا۔ یہی وجہ ہے یہ حضرات نہ صرف اپنے تلامذہ کو سنت کی حفاظت وصیانت کی تلقین کرتے بلکہ اپنے بچوں سے بھی کہتے کہ وہ ان مجالس میں شرکت کیا کریں، جن میں احادیث کا مذاکرہ ہوتا ہے، اس لیے کہ ان کے نزدیک احیاءِ سنت کا یہی طریق ایسا ہے کہ جس کے ذریعہ سنن کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کہا کرتے تھے:

احیاء الحدیث مذاکرتہ۔

کہ حدیث وسنن کا زندہ رکھنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ احادیث کے بارے میں باہم مذاکرہ سے کام لیا جائے۔

احادیث کو سننے اور جاننے کے لیے لوگ کس درجہ اشتیاق کا اظہار کرتے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اگر کوئی صحابی کسی گھر میں حدیث بیان کرتا، تو یہاں اتنا بڑا ہجوم جمع ہوجاتا کہ صحابی کو مکان کی چھت پر چڑھ کر احادیث سنانا پڑتیں۔ انس بن سیرین کا کہنا ہے کہ میں جماجم کی معرکہ آرائی سے پہلے کوفہ پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہاں چار ہزار اشخاص طلب حدیث میں مصروف ہیں۔ جامع دمشق میں حضرت ابو درداء کے حلقے میں ڈیڑھ ہزار طلبہ شریک ہوتے۔ اور احادیث وسنن سے اپنے ذہنوں کو منور کرتے۔ یہی حال حمص، حلب، فسطاط اور بصرہ کا تھا۔ یہاں بھی تعلیمی مجالس کا انعقاد ہوتا رہتا اور تشنگانِ علومِ سنت کی پیاس بجھائی جاتی۔

عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں مسجد حرام طالب علموں سے بھر جاتی۔ انھوں نے ایک مرتبہ لوگوں کے اس اشتیاق کو دیکھا تو پوچھا کہ تعلیم وتدریس کے ان حلقوں کے شیوخ

کون کون لوگ ہیں، جن کی وجہ سے مسجدِ حرام میں اس درجہ چہل پہل اور رونق ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ عطار، سعید بن جبیر، میمون بن مہران، مکحول اور مجاہد ایسے جلیل القدر اہلِ علم ان حلقوں کی سرپرستی فرماتے ہیں۔

صحابہ اور تابعین کی ان مجالسِ علمیہ میں جن آداب و شرائط کا خصوصیت سے خیال رکھا جاتا، وہ یہ ہیں:

۱۔ یہ حضرات طلبہ کی ذہنی سطح کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے اور حدیث کی تشریح و تبیین کے سلسلہ میں اس کے موقع و محل کو بھی واضح کرتے۔ اور کوئی ایسی حدیث بیان نہ کرتے، جو ان کی سمجھ سے بالا ہو۔

عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے:

ان الرجل ليحدث بالحديث فيسمعه من لا يبلغ عقله فهم ذلك الحديث فيكون عليه فتنة۔

بعض اوقات ایک شخص ایک حدیث بیان کرتا ہے اور ایسے شخص کو یہ حدیث سناتا ہے، جس کو وہ سمجھ نہیں پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حدیث اس کے لیے فتنہ ثابت ہوتی ہے۔

حماد کا کہنا ہے۔ ایوب کہا کرتے تھے:

لا تحدثوا الناس بما لا يعلمون فتضروهم۔

لوگوں سے ایسی احادیث بیان نہ کرو، جن سے ان کے ذہن آشنا نہیں۔ کیوں کہ اس صورت میں فائدہ کے بجائے تم ان کو نقصان پہنچاؤ گے۔

۲۔ صحابہ اور تابعین اس چیز کا بھی خیال رکھتے کہ احادیث کی تعلیم اور اس کے درس و تدریس کے دائرہ کو صرف ان ہی لوگوں تک محدود رکھیں، جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں یعنی سفہا اور اہل اہوا کو اپنا مخاطب نہ سمجھا جائے۔ اسی حقیقت کی طرف زہری نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے:

وهجنت نشره عند غير اهله۔

کہ میں نااہل لوگوں کے سامنے حدیث بیان کرنے کو معیوب سمجھتا ہوں۔

اعمش کی یہ جانی بوجھی رائے تھی کہ جو لوگ حدیث کے فہم وادراک سے قاصر ہیں، ان کے سامنے احادیث کی روایت کرنا اضاعتِ حدیث کے مترادف ہے۔

شعبی کہا کرتے تھے کہ علمِ حدیث کو وہی جان سکتا ہے جس میں زہد وعبادت اور عقل سلیم دونوں جمع ہوں۔ اگر کوئی شخص فہم وفراست سے تو بہرہ ور ہو، مگر زہد وعبادت کے جذبہ سے تہی ہو، تو اس سے کہا جائے گا کہ تمھارے بس کی یہ بات نہیں۔ اور اگر زاہد وعابد ہو، اور عقل وخرد کی دولت سے محروم ہو، تو اس سے کہا جائے گا کہ یہ امر ایسا ہے جسے صرف عقلا ہی جان سکتے ہیں —— تم اس کے اہل نہیں۔

حدیث کی اشاعت وتعلیم میں یہ حضرات کس درجہ احتیاط برتتے تھے، اس کا اندازہ زائدہ بن قدامہ کے اس طرزِ عمل سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ہاں جب کوئی شخص طلبِ حدیث کے لیے آتا۔ تو وہ باقاعدہ اس کا امتحان لیتے۔ اس سے پوچھتے تم کہاں سے آئے ہو اور کہاں نماز ادا کرتے ہو، اور اس طرح اس پر کڑی جرح کرتے جس طرح قاضی گواہ پر جرح کرتا ہے —— اور اثنار جرح میں اگر انھیں معلوم ہو جاتا کہ اس کا تعلق اہلِ اہوا سے ہے تو اس سے صاف صاف کہہ دیتے۔

لا تعودن الی هذا المجلس۔

کہ آئندہ اس مجلس میں آنے کی جرأت نہ کرنا۔

ان سے کہا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں، ان کا کہنا تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ نا اہل لوگ ائمہ حدیث بن جائیں اور مرجع خلائق قرار پائیں۔ اور پھر جب لوگ ان سے حدیث سننے کے لیے آئیں، تو یہ ان میں اپنی خواہشات کے مطابق تحریف کر دیں۔

بظاہر زائدہ بن قدامہ کے اس طرزِ عمل میں ایک طرح کا تشدد پایا جاتا ہے، لیکن یہ حضرات اگر اس حزم واحتیاط اور تنقید وتفحص سے کام نہ لیتے تو ان صحیح احادیث کا ذخیرہ امت تک نہ پہنچ پاتا، جس پر ملت کی دینی واخروی زندگی کا دار و مدار ہے۔

۳۔ قرآنِ حکیم چونکہ شریعت کی اساس اور ینبوع ہے۔ اور اسی پر فقہ واستدلال کے کاخہائے بلند استوار ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ طالب علم پہلے اس سے اپنے

سینوں کو فروزاں کرے، اور اس کے بعد احادیث وسنن کی طرف متوجہ ہو۔ اس بنا پر محدثین نے بالاتفاق اس بات پر زور دیا کہ جو شخص احادیث وسنن پر زور دینا چاہتا ہے، اور اس بات کا خواہاں ہے کہ اس رشتہ و تعلق کو سمجھنے کی کوشش کرے جو قرآن و سنت میں رونما ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ پہلے قرآن حکیم حفظ کرے اور پھر ان مجالس اور حلقوں میں شریک ہو، جہاں مشکوٰۃ نبوت کے انوار و تجلیات سے قلب و ذہن کی روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حفص بن غیاث کا کہنا ہے، میں اعمش کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے حدیث بیان کرنے کو کہا، انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ

اتحفظ القرآن۔

کیا تجھے قرآن حکیم یاد ہے۔

مَیں نے کہا، نہیں۔ اعمش نے کہا۔ جاؤ پہلے قرآن حکیم کے حفظ کی سعادت حاصل کرو، پھر میرے پاس آؤ، اس وقت مَیں تمھیں احادیث وسنن کی تعلیم دوں گا۔ چنانچہ میں نے ان کی نصیحت پر عمل کیا، اور اس کے بعد جب ان کے ہاں حاضری دی تو انھوں نے مجھے شرف تلمذ سے نوازا۔

۴۔ صحابہ و تابعین، تلامذہ کی نفسیات پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ تعلیم و تدریس کے سلسلے میں اگر تنوع اور تغیر کے تقاضوں کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو طلبہ پر ملال و اکتاہٹ کے طاری ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنے حلقہ ہائے درس میں مختلف موضوعات سے تعرض کرتے کبھی سیرتِ طیبہ کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے، کبھی رجال پر گفتگو کرتے، اور یہ بتاتے کہ کون ثقہ ہے اور کون ثقہ نہیں، اور کبھی حدیث کا پس منظر بیان کرتے اور اس کا ذکر کرتے کہ جس سے حدیث کا تعلق ہے۔ یہی نہیں، ان مجالس میں شعر و سخن کے تذکرے بھی ہوتے، اور اشعار جاہلیت سے لطف اندوز ہونے کے مواقع بھی فراہم کیے جاتے۔ امام زہری کا قول ہے:

روحوا القلوب ساعۃ وساعۃ۔

وقتاً فوقتاً، قلوب واذہان کے لیے تفریح وراحت کا سامان پیدا کرتے رہو۔

یہ حضرات دراصل فلسفۂ تعلیم کے اس راز کو اچھی طرح جان گئے تھے کہ علم کو بارآور بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ طبائع کی تازگی اور شگفتگی کو قائم رکھا جائے یہی وہ حکیمانہ نکتہ ہے جس کی طرف حضرت عائشہ نے یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے:

ایاک واملال الناس وتقنیطھم۔

کہ تم تعلیم وتدریس کے سلسلے میں تم لوگوں کو ملال اور مایوسی کا شکار نہ ہونے دو۔

۵۔ محدثین مجالس تدریس میں اختصار کا بھی بے حد خیال رکھتے تھے، اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ اوقاتِ درس کو خواہ مخواہ طول دیا جائے کیونکہ انھیں اس خطرے کا پوری طرح احساس تھا کہ ایسی صورت میں طلبہ میں پڑھائی کے لیے دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ جن احادیث کو سنتے ہیں ان کو اچھی طرح محفوظ نہیں رکھ پاتے۔

امام زہری سے مروی ہے:

اذا طال المجلس کان للشیطان فیہ نصیبٌ۔

کہ جب مجلس درس زیادہ عرصہ تک قائم رہے تو اس میں شیطان حصہ دار بن جاتا ہے۔

۶۔ صحابہ وتابعین کے ہاں تدریس حدیث کے سلسلے میں کس درجہ احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا، اس کا اندازہ ان روایات سے لگائیے۔

ضرار بن مرہ سے مروی ہے کہ اساتذۂ حدیث مسندِ درس پر بیٹھنے سے پہلے عموماً وضو کر لیا کرتے تھے۔

قتادہ کا کہنا ہے کہ استحباب کا تقاضا یہ ہے کہ بغیر وضو کیے احادیثِ رسول کا درس نہ دیا جائے۔

سعید بن المسیب کے بارے میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ یہ صاحبِ فراش

تھے کسی نے ان سے حدیث بیان کرنے کو کہا، تو انھوں نے فرمایا:

اجلسونی فانی اکرہ ان احدث حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا مضطجعٌ۔

پہلے مجھے سہارا دے کر بٹھا دو میں لیٹے لیٹے حدیثِ رسول بیان کرنا سوءِ ادب سمجھتا ہوں۔

امام مالک سے متعلق مشہور ہے کہ وہ جب تدریسِ حدیث کے لیے گھر سے نکلتے تو پہلے وضو کرتے۔ بہترین لباس زیب تن کرتے اور داڑھی کے بالوں کو کنگھی سے باقاعدہ سنوارتے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ تو آپ فرماتے:

حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

میں حدیثِ رسول کے احترام و توقیر کے پیش نظر ایسا کرتا ہوں۔

احادیث کے آدابِ تدریس کیا کیا ہیں۔ اور محدثین نے اس سلسلے میں کن کن اصولوں کی پیروی کی ہے۔ اس پر خصوصیت سے خطیب بغدادی کی کتاب "الجامع لاخلاق الراوی و اداب السامع" قابلِ ذکر ہے۔

صحابہ و تابعین کے زمانے میں اشاعتِ حدیث کے اسباب و عوامل

اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے نہ صرف توحید کا صاف ستھرا تصور پیش کیا بلکہ شرفِ انسانیت کو تابندگی بخشی، اور ان تمام زنجیروں کو اتار پھینکا، جن کی گراں باری سے تہذیب و تمدن کے رواں دواں قافلے رک گئے تھے۔ اسلام آزادی، انسان دوستی اور اخوت کے علم بردار کی حیثیت سے دنیا بھر میں ابھرا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ضیا افشانیوں سے سارا عالمِ انسانی جگمگا اٹھا۔ ابھی دوسری صدی اختتام پذیر نہ ہوئی تھی کہ اس کے پیغام رشد التیام نے دور دراز کے علاقوں کو اسلام کے پرچم تلے جمع کر دیا۔ سترہ ہجری میں تمام بلادِ عراق و شام میں اسلام پھیل چکا تھا۔ بیس سال کے بعد مصر فتح ہوا۔ حضرت عثمان کے عہدِ خلافت میں غازیانِ اسلام ماوراء النہر تک پہنچ چکے تھے۔ سن چھپن میں سمرقند تک مجاہدینِ اسلام نے تگ و تاز کی۔ یہی نہیں، اسلامی فتوحات کا دائرہ دوسری صدی کے اوائل ہی میں چین کی سرحدوں تک وسعت پذیر ہو چکا تھا۔ اسلام کی یہ حیرت انگیز فتوحات استعماری نوعیت کی نہیں تھیں، اور ان سے ہرگز یہ مقصود نہ تھا کہ مفتوحہ اقوام کو غلام بنایا جائے اور ان کے مال و دولت کا استحصال کیا جائے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ایک تمدنی اور تہذیبی تحریک تھی جو انسانیت کو ترقی کے بامِ عروج تک پہنچانے کی ضامن تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ سراسر ایک اخلاقی و روحانی انقلاب تھا، جو رونما ہوا اور اس کی تہہ میں یہ نصب العین کارفرما تھا کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی چوکھٹ پر جھکایا جائے۔ ان کو خدا اور رسول کی تعلیمات سے آگاہ کیا

جائے اور یہ بتایا جائے کہ سیرت و کردار کی استواری کے لیے کس نوع کی ہدایات کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ان ممالک کو فتح کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا تھا بلکہ ان میں ایسے تعلیمی اور تربیتی اداروں کی طرح ڈالی تھی، جن میں کتاب و سنت کی روشنی سے قلوب و اذہان کو مستنیر کیا جاتا تھا۔

آئیے! ان علمی مراکز پر ایک چھچھلتی ہوئی نظر ڈالتے چلیں جن کا سلسلہ مدینہ منورہ سے لے کر فاریاب تک پھیلا ہوا تھا اور یہ دیکھیں کہ ان میں کن کن محدثین نے علوم حدیث کی اشاعت و تدریس میں خصوصیت سے حصہ لیا۔

۱۔ **مدینہ منورہ**: اس شہر پُر انوار کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ آنحضرتؐ نے اس کو مہجر اور مستقر قرار دیا۔ یہیں اسلام کے تشریعی ابواب کی تکمیل ہوئی۔ اور یہی وہ مقامِ مقدس ہے جہاں صحابہ نے آنحضرتؐ سے براہِ راست کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کی، جن صحابہ کبار نے یہاں کی اقامت کو ترجیح دی اور یہاں رہ کر حدیث و سنت کی دعوت کو پھیلایا۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ عبداللہ بن عمر، ابوسعید الخدری اور زید بن ثابت ایسے حضرات ہیں، جو قرآن و حدیث کے فہم و ادراک میں مشہور ہوئے۔

صحابہ کے بعد جن تابعین نے ان کے علوم کی تبلیغ و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قضا و فتویٰ میں مرجع عوام بنے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

سعید بن المسیب، ابن شہاب الزہری، عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود، سالم ابن عبداللہ ابن عمر، محمد بن المکندر وغیرہم۔

۲۔ **مکۃ المکرمہ**: جب آنحضرتؐ فتح مکہ کی مہم سے فارغ ہوئے تو یہاں حضرت معاذ بن جبل کو بحیثیت معلم متعین کیا۔ یہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے۔ یہی نہیں یہ ان میں تفقہ فی الدین کی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتے تھے اور قرآن حکیم کی تعلیم سے بھی بہرہ ور کرتے تھے۔ حضرت معاذ اپنے علم و حلم اور

سخاوت جود میں انصار کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ جہاں تک حلال و حرام کو جاننے کا تعلق ہے اس بارے میں یہ تمام صحابہ پر فوقیت رکھتے تھے۔

اس کے بارے میں خود آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:

معاذ بن جبل اعلم الناس بحرام اللہ وحرامه۔

معاذ بن جبل حلال و حرام کے معاملے میں اعلم الناس ہیں۔

ان سے متعلق آنحضرتؐ کا یہ بھی ارشاد ہے:

خذوا القرآن من اربعة عن ابن مسعود، و ابی و معاذ بن جبل و سالم مولیٰ ابی حذیفة۔

قرآن حکیم کو ان چار لوگوں سے سیکھو۔ عبداللہ بن مسعود سے، ابی سے، معاذ بن جبل سے، اور سالم سے جو ابو حذیفہ کے غلام ہیں۔

ان سے صحابہ کی بہت بڑی تعداد نے روایت کی ہے، جن میں حضرت عبداللہ بن عباس کا نام نامی خاص شہرت کا حامل ہے۔ ان کے علاوہ مکہ میں خالد ابن اُسید، الحکم بن ابی العاص اور عثمان بن ابی طلحہ نے بھی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیئے۔

مکہ میں صحابہ کے مدرسۂ فیض سے جن لوگوں نے خصوصیت سے استفادہ کیا۔ ان میں مجاہد، عطا ابن ابی رباح، طاؤس بن کیہان، عکرمہ وغیرہ کا نام شامل ہے۔

مزید برآں مکہ مکرمہ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ موسم حج میں بہت بڑی تعداد میں لوگ یہاں آتے۔ فریضہ حج ادا کرتے اور صحابہ و تابعین سے کسب فیض کرتے۔ اور پھر جب اپنے شہروں کو لوٹتے تو اپنے ساتھ احادیث، سنن کے خزائن اور روشنی لے کر جاتے اور ان کو ان لوگوں میں بانٹتے اور پھیلاتے جو حج کی سعادت سے محروم رہے۔

۳۔ کوفہ: جب عراق فتح ہوا تو صحابہ کی کثیر تعداد نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں کوفے کا قصد کیا۔ جس میں ایک روایت کے مطابق تین سو صحابہ وہ تھے جن کو

اصحاب الشجرہ کے پُرفخار کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور ستّر وہ تھے جنھوں نے غزوۂ بدر میں شرکت کی۔ ان میں سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید بن عمرو بن نفیل اور عبداللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ کوفہ کے نام کو حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے تلامذہ نے زیادہ روشن کیا اور ان کے چشمۂ فیض سے جو لوگ سیراب ہوئے، ان میں الربیع بن خیثم، کمیل بن زید النخعی، الشعبی، سعید بن جبیر الاسدی، ابراہیم النخعی، ابو اسحاق السبیعی اور عبدالملک بن عمیر وغیرہ ایسے شیوخ فقہ و حدیث نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ دوسری اور تیسری ہجری میں یہ فقہ و تفنین کا اہم مرکز قرار پایا۔

۴۔ **بصرہ**: کوفہ کے بعد یہ دوسرا علمی مرکز ہے، جس کو حضرت انس بن مالک، حضرت ابوموسیٰ اشعری، اور حضرت عبداللہ بن عباس نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا۔ ان کے علاوہ، عتبہ بن غزوان، عمران بن حصین، ابوبرزہ الاسلمی، معقل بن یسار، عبدالرحمٰن بن سمرۃ، ابوزید الانصاری، عبداللہ بن الشخیر وغیرہ صحابہ کا بھی یہاں آنا ثابت ہے۔

حدیث و سنت کے اس مرکزِ علمی سے جن لوگوں نے استفادہ کیا، ان میں الحسن البصری جیسے جلیل القدر تابعی بھی ہیں، جنھوں نے پانچ سَو کے قریب صحابہ سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ یہی نہیں، محمد بن سیرین، ایوب السختیانی، بہز بن حکیم القشیری، یونس بن عبید، خالد بن مہران الحذاء، عبداللہ بن عون عاصم بن سلیمان الاحول، قتادہ بن دعامہ السدوسی اور بن ہشام بن حسان وغیرہ تابعین بھی اسی مرکزِ علمی سے فیض یاب ہو کر نکلے۔

۵۔ **شام**: شام فتح ہوا تو صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد نے جو جیش اسلامی ہی کا ایک حصہ تھی۔ یہاں کے بلاد و امصار میں اقامت اختیار کر لی۔

الولید بن مسلم کا کہنا ہے:

دخلت الشام عشرۃ الاف عین رأت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

شام میں ایسی دس ہزار آنکھیں داخل ہوئیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوئیں۔

یزید بن سفیان نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ یہاں ایسے اہلِ علم کی ضرورت ہے جو لوگوں میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کریں۔ حضرت عمرؓ نے اس پر معاذ بن جبلؓ عبادہ بن الصامتؓ اور ابو درداءؓ کو روانہ کیا جو شام کے مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ حضرت عبادہؓ نے حمص میں اقامت اختیار کی۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے دمشق کو مستقر ٹھہرایا اور حضرت معاذؓ نے تعلیم وارشاد کے لیے فلسطین کا انتخاب کیا۔ ان لوگوں کی مساعی جمیلہ سے یہاں کتاب وسنت کی اشاعت کے لیے علمی مراکز قائم ہوئے اور اسلامی تہذیب وتمدن کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ خصوصیت سے اموی دور میں تو فقہا محدثین اور معلمین کی ایک بہت بڑی تعداد یہاں آبسی تھی جس نے آکر یہاں اپنے فیوض سے لوگوں کو بہرہ مند کیا۔

سمعانی کا کہنا ہے کہ اس وقت داریا محدثین کا مرکز تھا۔

ان کے علاوہ بلادِ شام کو جن صحابہ نے اپنی آمد سے نوازا، وہ یہ ہیں:

ابو عبیدہ بن الجراحؓ۔ بلال بن رباحؓ، شرجیل بن حسنہؓ، خالد بن الولیدؓ، عیاض بن غنمؓ، الفضل بن العباس بن عبد المطلبؓ (یہ اردن میں مدفون ہیں) عوف بن مالک اور شجعیؓ اور العرباض بن ساریہؓ وغیرہم۔

ان مراکزِ علمی میں تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت نے علم وآگاہی کی منزلیں طے کیں۔ اور کتاب وسنت کی برکات سے استفادہ کیا، جیسے سالم بن عبد المحاربی قاضی دمشق، ابو ادریس الخولانی۔

(یہ حضرت معاویہ اور ان کے بیٹے یزید کے زمانے میں عہدۂ قضا پر فائز رہے)

ابو سلیمان الدارانی (یہ بھی عمر بن عبد العزیز کے زمانے سے لے کر ہشام بن عبد الملک کے عہد تک تقریباً تیئس سال تک دمشق کے قاضی رہے) اور عمیر بن ہانی، العنسی الدارانی جو المحدث کے لقب سے ملقب ہوئے۔

عبدالرحمن بن عمرو الاوزاعی ۔ (امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے معاصر) جنھیں امام اہل الشام کہا جاتا ہے ۔ اسی مدرسہ علمی کے فیض یافتہ ہیں ۔ اور اسی مدرسہ سے تعلق رکھنے والوں میں مکحول الدمشقی، عمر بن عبدالعزیز، رجا بن حیوہ، بجیر بن سعد الکلاعی، ثور بن یزید الکلاعی اور عبدالرحمن بن یزید جابر وغیرہم کا شمار ہوتا ہے ۔

۶ ۔ **مصر :** حضرت عمر بن الخطاب کے زمانے میں عمرو بن العاص کی زیرِ قیادت اسلامی عساکر کا مصر پر قبضہ ہوا، ان جیوش کے ساتھ صحابہ کی ایک بہت بڑی جماعت آئی ۔ ان میں الزبیر بن العوام، عبادۃ بن صامت، مسلمہ بن مخلدؓ اور المقداد بن الاسود کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے ۔ انھی میں عبداللہ ابن عمرو بھی تھے، جنھوں نے مصر میں اپنے والد کی وفات کے بعد تک قیام کیا، ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ آنحضرتؐ کے عہدِ مبارک میں بھی احادیث کی تدوین اشاعت میں سرگرم رہے ۔ یہاں ان کے سرچشمہ فیض سے بہت سے محدثین بہرہ مند ہوئے ۔

مصر میں ان کے علاوہ اور صحابہ نے بھی قیام کیا، جیسے عقبہ بن عامر الجہنی، خارجہ بن حذافہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، محمیہ بن جزء، عبداللہ بن الحارث بن جزء، ابو بصرۃ الغفاری، ابوسعد الخیر، معاذ بن انس الجہنی، معاویہ بن خدیج اور زیاد بن الحارث الصدائی وغیرہ ۔

ان صحابہ سے جن لوگوں نے کتاب و سنت کی تعلیم و تربیت حاصل کی اور دین کے ان دونوں دھاروں سے اپنی پیاس بجھائی، اور تسکین و طمانیت کی دولت سے مالا مال ہوئے ۔ ان کے نام تاریخ و رجال کی کتابوں میں مندرج ہیں ۔ ان میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی، وہ یہ ہیں :

یزید بن ابی حبیب محدث دیارِ مصر ۔ عمر بن الحارث، خیر بن نعیم الحضرمی، عبداللہ بن سلیمان الطویل، عبدالرحمن بن شریح الغافقی اور حیوۃ بن شریح التجیبی ۔

مصر میں اشاعتِ حدیث کے سلسلے میں عموماً یزید بن ابی حبیب کا نام لیا جاتا ہے ۔ ان کے تلامذہ میں اللیث بن سعد اور عبداللہ بن لھیعہ دو ایسے بزرگ

ہیں، جن کے فیوض علمی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کو اپنے دور میں تمام بلادِ مصر میں بجا طور پر محدث کے لقب سے ملقب ہونے کا فخر حاصل تھا۔ ان کے ذریعے مصر کے کونے کونے اور گوشے گوشے میں حدیث وسنت کا چرچا ہوا۔

۷۔ مغرب واندلس: برقہ اور اندلس میں جب اول اول حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانے میں عمرو بن العاص پہنچے تو انھوں نے حضرت فاروق سے اجازت طلب کی، کہ عساکرِ اسلام کو افریقہ تک بڑھنے کی اجازت دی جائے لیکن حضرت فاروق نے انھیں مزید پیش قدمی سے روک دیا۔ لیکن جب حضرت عثمان بن عفانؓ نے زمامِ خلافت اپنے ہاتھ میں لی تو انھوں نے امیرِ مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو اجازت دی، کہ افریقہ کو اسلام کے زیرِ نگین لایا جائے، اور ان کی مدد کے لیے انھوں نے صحابہ میں سے بہت سے لوگوں کو بھیجا، جن میں عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، عبداللہ بن جعفرؓ، حضرت حسنؓ اور حسینؓ اور عبداللہ بن الزبیرؓ وغیرہ ایسی جلیل القدر شخصیتیں شامل تھیں۔ مغرب کو اسلام کے علَم تلے جمع کرنے کے لیے معاویہ بن حدیج نے باقاعدہ غزوات کا سلسلہ شروع کیا۔ سلیمان بن یسار کا کہنا ہے:

غزونا افریقیۃ مع ابن حدیج ومعنا من المھاجرین والانصار بشر کثیر۔

کہ ہم نے افریقہ کے خلاف ابن حدیج کی معیت میں جہاد کیا اور اس غزوہ میں ہمارے ساتھ مہاجرین وانصار کی بہت بڑی تعداد شریک تھی۔

اس کے بعد عقبہ بن نافع مغرب میں والی مقرر ہوئے۔ ان کے جیش میں صحابہ اور تابعین کی کثرت تھی۔ انھی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ انھوں نے مغرب اقصیٰ کو فتح کیا اور پورے شمالی افریقہ میں اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے۔

کچھ اور صحابہ بھی ان دیار سے کھنچے ہوئے آئے۔ ان میں مسعود بن الاسود البلویؓ بھی تھے، جن کا شمار اصحاب الشجرہ میں ہوتا ہے۔ المسور بن مخرمہؓ اور المقداد بن الکندیؓ بھی تھے، جو سابقین اولین میں سے تھے۔ علاوہ ازیں فقہاء صحابہ

میں سے جبلہ بن عمرو بن ثعلبہ نے بھی ان بلاد کو اپنے قیام سے نوازا۔

افریقہ میں آنے والوں میں تابعین کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ السائب بن عامر بن ہشام، معبد، عبداللہ بن عباس کے بھائی، عبدالرحمٰن بن الاسود، عاصم بن عمر بن الخطاب، عبدالملک بن مروان، عبدالرحمٰن بن زید بن الخطاب، اور سلیمان بن یسار فقیہ مدینہ کا شمار انہی تابعین میں ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً بلادِ افریقہ میں وارد ہوئے۔ اور جنھوں نے یہاں کے بسنے والوں کو کتاب و سنت کے احکام و مسائل سے آگاہ کیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہدِ خلافت میں دس ایسے تابعین کو یہاں بھیجا، جن کے فرائض میں یہ بات داخل تھی کہ اہلِ افریقہ میں دین کی سمجھ بوجھ اور تفقہ پیدا کریں، ان میں حبان بن ابی جبلہ، اسمٰعیل بن عبیداللہ الاعور، اسمٰعیل بن عبید، عبدالرحمٰن بن رافع التنوخی قاضی افریقہ اور سعید بن مسعود التجیبی کا نام تاریخ و سیر کی کتابوں میں ثبت ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں، جن کی تعلیمی خدمات نے یہاں اسلام کو پھیلانے اور فروغ دینے میں خصوصیت سے مدد دی۔

انھیں حضرات کی تعلیمی اور تبلیغی کوششوں کا یہ ثمرہ ہے کہ یہاں کے مقامی حضرات میں بھی اہلِ علم کی اچھی خاصی کھیپ تیار ہوگئی۔ جیسے زیاد بن نعم المعافری، المغیرہ بن سلمہ اور مسلم بن یسار الافریقی وغیرہ۔

صحابہ و تابعین کی انہی علمی مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ قیروان دیکھتے ہی دیکھتے اسی طرح اہلِ مغرب کی توجہ کا مرکز بن گیا، جیسے تیسری صدی میں اندلس، قیروان میں سحنون بن سعید اور سعید بن محمد الحداد نے فقہ و حدیث کا درس دیا، اور بلادِ اندلس میں، یحییٰ بن یحییٰ، ابن حبیب اور بقی بن مخلد وغیرہ نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو عام کیا۔

۸۔ یمن: اس خطہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اوّل اوّل خود آنحضرت نے یہاں رشد و ہدایت اور تربیت کی غرض سے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ الاشعری کو بھیجا۔

ان کے علاوہ اور صحابہ بھی یہاں اقامت گزین ہوئے۔ یہاں تابعین کی جس جماعت نے شہرت حاصل کی، ان میں ہمام بن منبہ اور وہب بن منبہ کا نام نامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔

۹۔ خراسان: اس دُور افتادہ سرزمین میں بھی صحابہ نے قدم رنجہ فرمایا، اور یہاں کے رہنے والوں کو کتاب وسنت کے احکام و اوامر سے مطلع کیا۔ حضرت بریدہ بن حصیب الاسلمی نے تو یہیں وفات پائی اور مرو میں دفن ہوئے۔ ان کے علاوہ ابو برزۃ الاسلمی، حکم بن عمرو الغفاری، اور عبداللہ بن خازم الاسلمی بھی یہاں آئے۔ اور نیسا پور میں انتقال فرمایا۔ خراسان کے بلاد و امصار میں بڑے بڑے محدثین نے حدیث کا درس دیا۔ مثلاً:

(بخارا) میں عیسٰی بن موسیٰ غنجار، احمد بن حفص الفقیہ، محمد بن سلام البیکندی اور عبد بن محمد السندی۔ ایسی شخصیتیں کتاب وسنت کے فروغ کا باعث بنیں۔ اور ان کے بعد اس خطّے کو یہ افتخار حاصل ہے کہ یہاں امام المحدثین ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل ایسے نابغہ پیدا ہوئے کہ جن کے فیوضِ علمی سے آج بھی عالم اسلامی بہرہ ور ہے۔

(سمرقند) کے علاقہ میں جن محدثین نے شہرت حاصل کی۔ ان میں ابو عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی اور محمد بن نصر المروزی کا نام کون نہیں جانتا۔

(فریاب) میں بھی علما کی بہت بڑی جماعت تیار ہوگی، جیسے محمد بن یوسف الفریابی اور قاضی جعفر بن محمد الفریابی، یہ صاحب تصانیف ہیں۔ ۲۲۶ ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔

فتوحات اسلامی اور صحابہ و تابعین کا مختلف بلاد و ممالک میں پھیل جانا اور یہاں کتاب وسنت کے مراکز قائم کرنا۔ ایک زبردست عامل تھا۔ جس کے ذریعے ریاضِ سنت کی شمیم آرائیاں اور دُور دراز علاقوں تک پہنچیں۔ دوسرا عامل جس سے حدیث سنت کی توسیع تر اشاعت ہوئی۔ صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین کا یہ

جذبہ تھا کہ ایک ایک حدیث کو معلوم کرنے کے لیے سفر کی صعوبتوں کو برداشت کیا جائے اور جہاں کہیں بھی ارشد و ہدایت کی کوئی کرن ہے اس سے اپنے دامن کردار و عمل کے گوشوں کو سنوارنے اور چمکانے کی سعی کی جائے۔

حدیث و سنت کی طلب و جستجو کے سلسلے میں سفر اختیار کرنے کا عمل آنحضرتؐ کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نوع کے واقعات کا ثبوت ملتا ہے کہ بعض حضرات جب اپنے اپنے مقام پر اسلام کی دعوت سے روشناس ہوتے تو ان کی یہ کوشش ہوتی کہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر براہِ راست کتاب اللہ کی تعلیم حاصل کریں۔ اور اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ تاکہ اپنی قوم میں جا کر اسلام کی تبلیغ کر سکیں۔ جیسا کہ ضمام بن ثعلبہ کے واقعہ سے ظاہر ہے۔

صحابہ تابعین اور اتباع تابعین کے دور میں اس بات کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ طلبِ حدیث کے لیے علما اپنے گھروں سے نکلے، سفر کی مشکلات کا سامنا کیا۔ اور وہاں تک پہنچ کر دم لیا۔ جہاں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

ابو ایوب انصاری کے بارے میں منقول ہے کہ صرف ایک حدیث معلوم کرنے کے لیے انھوں نے مصر تک کی طویل مسافت طے کی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ صرف عقبہ بن عامر ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے اس حدیث کو آنحضرتؐ سے سنا، اور اس وقت وہ مصر میں مقیم تھے۔ یہ جب یہاں پہنچے تو سب سے پہلے امیرِ مصر مسلمہ بن مخلد سے ملاقات کی۔ مسلمہ ان سے بڑے تپاک سے ملے۔ انھوں نے پوچھا کہ عقبہ بن عامر کا گھر کہاں ہے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ بات کیا ہے کہ آپ نے کیوں اس درجہ زحمت فرمائی۔ ابو ایوب نے جواب میں کہا:

حدیث سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، لم یبق احد سمعہ من رسول اللہ علیہ وسلم غیری وغیر عقبۃؓ ——— فابعث من یدلنی علی منزلہ۔

ایک حدیث میں نے آنحضرت سے سنی تھی، اس کی تصدیق چاہتا ہوں، اور صحابہ میں چونکہ میرے اور عقبہ رضؓ کے سوا اور کوئی باقی نہیں رہا جس نے آنحضرتؐ سے اس حدیث کو سنا ہو۔ اس لیے ایسا آدمی میرے ساتھ بھیج دیجیے جو مجھے ان کے گھر کا پتا بتا سکے۔

انھوں نے ایک صاحب کو ان کے ساتھ کر دیا، جو ان کو عقبہ کے گھر تک لے گئے۔ حضرت عقبہ کی نظر ان پر پڑی تو انھوں نے ازراہ استعجاب ان سے کہا:

ما جاءبک یا ابا ایوبؓ۔

ابا ایوبؓ تمھیں یہاں تک کون چیز کھینچ لائی ہے۔

انھوں نے کہا، بھائی! میں نے ستر مومن سے متعلق ایک حدیث آنحضرتؐ سے سنی تھی۔ اور چونکہ میرے اور آپ کے سوا کوئی صحابی اس کو جاننے والا زندہ نہیں رہا، اس لیے وہ حدیث مجھے سنا دیجیے۔

عقبہ نے جواب میں کہا، کیوں نہیں! میں نے آنحضرتؐ سے یہ حدیث سنی ہے:

من ستر مومنا فی الدنیا علی خزیۃ سترہ اللہ یوم القیمۃ۔

جو شخص اس دنیا میں کسی مومن کی برائی کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اللہ قیامت کے دن اس کی برائیوں کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

حضرت ابوایوب نے جب اس طرح حدیث کی توثیق کر لی تو فرمایا، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد مدینے کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت ابوایوبؓ کا حجاز سے مصر تک کا یہ طویل اور تھکا دینے والا سفر محض اس بنا پر تھا کہ اس حدیث کے بارے میں جس کو انھوں نے خود بھی سن رکھا تھا مزید اطمینان حاصل کر لیں۔

تابعین اور اتباع تابعین کے عہد میں طلب حدیث کے سلسلے میں سفر اختیار کرنے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

ابو العالیہ سے مروی ہے:

کنا نسمع الروایة عن اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ بالبصرة، فلم نرض حتی رکبنا الی المدینة فسمعناھا من افواھھم۔

ہم بصرہ میں اصحابِ رسول سے جب کوئی روایت سنتے تھے تو ہم اس پر قناعت و رضا کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم کوچ کر کے مدینہ پہنچتے اور دوسرے صحابۂ رسول سے اس روایت کو براہِ راست سنتے۔

شعبی نے صرف تین احادیث کی تصدیق کے لیے مدینہ تک کا سفر اختیار کیا۔

یہ لوگ حدیث کے معاملہ میں کس درجہ محتاط تھے، اس کا اندازہ مسروق سے متعلق اس روایت سے لگا ہے کہ:

رحل فی حرف۔

انھوں نے صرف ایک حرف یا لفظ کی تصدیق کی خاطر سفر اختیار کیا۔

کثیر بن قیس سے روایت ہے کہ میں ابو درداء کے پاس دمشق کی ایک مسجد میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک شخص ان کے پاس آیا اور بولا کہ میں آپ کے ہاں مدینۃ الرسول سے آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک حدیث بیان کیا کرتے ہیں وہ مجھے سنائیے۔ آپ نے کہا، صرف حدیث سننے کے لیے آئے ہو یا تجارت وغیرہ کے لیے۔ اس نے کہا صرف حدیث سننے کے لیے۔ اس پر آپ نے یہ حدیث سنائی:

من سلك طریقاً یلتمس فیہ علماً سھل اللّٰہ لہ طریقا الی الجنة وان الملئکة لتضع اجنحتھا رضا لطالب العلم وان طالب العلم یستغفر لہ من فی السماء والارض حتی الحیتان فی الماء وان فضل العالم علی العابد کفضل القمر علی سائر الکواکب ان العلماء ورثة الانبیاء، لم یورثوا دینارًا ولا درھما۔ انما ورثوا العلم فمن اخذہ اخذ بحظ وافر۔

جو شخص حصولِ علم کی راہ پر گام فرسا ہوتا ہے۔ اللہ اس کے لیے جنت کی راہ کو

آسان کر دیتا ہے اور فرشتے اظہار خوشنودی کے طور پر اس کے لیے اپنے پَر رکھ دیتے ہیں اور طالب علم کے لیے جو بھی آسمان اور زمین میں ہیں بخشش کی دعا کرتا ہے حتیٰ کہ وہ مچھلیاں بھی جو پانی میں ہیں۔ اور عالم کو ایک عابد پر اسی طرح فضیلت و برتری حاصل ہے جس طرح چاند کو ستاروں پر۔ علما انبیا کے وارث ہیں۔ ان کو دینار و درہم کا وارث نہیں ٹھہرایا گیا۔ ان کی میراث علم سے ہے۔ سو جو اس سے بہرہ ور ہوا وہ حظ وافر سے بہرہ ور ہوا۔

غرض کتب احادیث و تراجم میں اس طرح کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ کہ علما نے روایت و احادیث کی طلب و جستجو کی خاطر سفر کی صعوبتیں بخندہ پیشانی برداشت کیں۔ ابن شہاب کے بارے میں آتا ہے کہ یہ شام پہنچے تاکہ عطا بن یزید محریز اور ابن حیوۃ سے ملاقات کریں۔ یحییٰ بن ابی کثیر سے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے مدینہ تک کی منزلیں طے کیں، تاکہ اولاد صحابہ سے سماع کا فخر حاصل کریں۔ محمد بن سیرین محض اس وجہ سے کوفہ میں فروکش ہوئے کہ یہاں عبیدہ، علقمہ اور ابن ابی لیلیٰ کے علم و فقہ سے استفادہ کر سکیں۔ سفیان الثوری نے تلاش علم کے سلسلے میں یمن اور بصرہ تک کا سفر اختیار کیا، اور عیسیٰ بن یونس نے صرف اوزاعی سے ملنے کی غرض سے شام تک تگ و تاز کی۔

یہ اور اس نوع کے دیگر واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں گویا علما کا یہ دستور و معمول بن گیا تھا کہ اپنی علمی تشنگی دور کرنے کے لیے مختلف بلاد و امصار اور مراکز تدریس میں گھومیں پھریں۔ سفر و ترحال کے شدائد جھیلیں اور بچشم خود دیکھیں کہ کہاں کہاں احادیث و سنن کے چشمے رواں دواں ہیں، اور کون کون وہ اہلِ علم اور اصحابِ فن ہیں، جن سے احادیث و روایاتِ رسول کے سلسلے میں فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سفر و ترحال کے اس دستور و معمول کو اختیار کرنے سے بہت بڑا فائدہ یہ مترتب ہوا کہ ایک ہی حدیث کے مختلف طرق فکر و نظر کے سامنے آئے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ ان میں کون طریق زیادہ قوی اور سدید ہے، اور کون ضعیف۔

اس بات کا بھی سراغ ملا کہ زیر بحث حدیث کے اسباب وعوامل کیا تھے لوگ سلسلۂ سند کو ان صحابہ تک پہنچاتے تھے، جنھوں نے آنحضرتؐ کے افتا و قضا یا ارشاد و عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور اپنے کانوں سے سنا تھا۔

ان تصریحات سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ صحابہ اور تابعین کی مساعی کی بدولت قرونِ اولیٰ میں قرآن حکیم کے پہلو بہ پہلو احادیث وسنن کی تعلیم وتدریس کے دائروں نے کس درجہ وسعت اختیار کی، اور کیونکر سارے عالمِ اسلامی میں اس تہذیب وتمدن کا چرچا ہوا، جس نے کہ تمام انسانوں کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ نئے بال وپر دیے۔ نئی منزلوں کی نشاندہی کی اور نئے اندازِ زیست سے آگاہ کیا۔ تہذیب وتمدن کا یہ نقشہ وہی تھا، جس کو آنحضرتؐ نے وحی وتنزیل کی روشنی میں ایک خاص ترتیب ونہج کے ساتھ پیش کیا۔ یہ نقشہ کیا تھا؟ اور اس کے کیا خدوخال تھے؟ اس کی حقیقی جھلک دیکھنا ہو تو صحابہ، تابعین اور اتباعِ تابعین کی ان کوششوں پہ ایک نظر ڈالنا ہوگی، جنھوں نے قرآن حکیم کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اسوۂ رسول کی ایک ایک ادا کی تلاش وتفحص کے ضمن میں دُور دراز علاقوں کا سفر طے کیا، اور نہ اس طرح نہ صرف احادیث روایات کی روشنی سے اپنے قلب وذہن کے گوشوں کو چمکایا اور تابندہ رکھا۔ بلکہ اس کی اشاعت کے لیے درس وتدریس کے مراکز بھی قائم کیے اور ان مراکز اور اداروں میں رہ کر جن لوگوں نے تعلیم وتربیت کے مراحل طے کیے انھی نے آئندہ چل کر حدیث کی باقاعدہ تدوین کے لیے راہیں ہموار کیں اور ہم تک ان گہر ہائے گراں مایہ کو پہنچایا، جن سے ہماری تہذیب اور ہمارا ضابطۂ حیات ثروتِ فکر وعمل سے مالا مال ہوتا ہے اور ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ اس کو فخر کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کر سکیں۔

روایت کی دو قسمیں

صحابہ، تابعین اور ان کے اتباع کی عادت میں یہ بات داخل تھی کہ بالعموم آنحضرتؐ کے ارشادات، اعمال یا تقریرات کو من وعن بیان کیا جائے اور اپنی طرف سے اس میں کسی حذف یا اضافہ سے کام نہ لیں۔ بعض تو اس بارے میں اس درجہ احتیاط و تورع سے کام لیتے تھے کہ نہ صرف حرف یا کلمہ کی تبدیلی کو ناجائز سمجھتے تھے، بلکہ ان کے ہاں یہ بھی درست نہ تھا کہ روایت میں جو الفاظ جس ترتیب سے وارد ہوتے ہیں ان میں کسی طرح کی تقدیم و تاخیر کو روا رکھا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

من سمع حدیثاً فحدث بہ کما سمع فقد سلم۔

جس شخص نے حدیث سنی، اور اس کو جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیا، وہ احتساب سے بچ گیا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے وہ حدیث بیان کی جس میں اسلام کے ارکانِ خمسہ کا ذکر ہے۔ اس کو ایک شخص نے سنا، لیکن جب اس کو دہرایا تو اس کی اس ترتیب کو قائم نہ رکھ سکا، جو حدیث میں مذکور تھی۔ عبداللہ بن عمر نے اس پر فوراً اس کو ٹوکا اور بتایا کہ اس حدیث میں یہ الفاظ اس ترتیب سے آئے ہیں۔ رواتِ حدیث میں بعض حضرات یہ بھی گوارا نہیں کرتے تھے کہ حدیث میں اگر ایک لفظ مشدد آیا ہے تو اس کو لفظ خفیف سے بدل دیں۔

کچھ حضرات مزید احتیاط سے کام لیتے اور اس وقت تک مطمئن نہ ہوتے جب تک سننے والا حدیث کے الفاظ کو قلم بند نہ کرلے۔ محمد بن عمرو اپنے سامعین سے کہا کرتے تھے:

لا احدثکم حتی تکتبوہ۔
میں اس وقت تک حدیث بیان نہیں کروں گا، جب تک تم اس کو لکھ نہ لو۔
ابنِ عون کا کہنا ہے، میں نے تین اشخاص کو دیکھا جو روایت کے معاملے میں اس بات کے قائل تھے کہ اس میں الفاظ و حروف کی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔ قاسم بن محمد کو حجاز میں، محمد بن سیرین کو بصرہ میں اور رجا بن حیوہ کو شام میں۔

ابنِ عیینہ سے روایت ہے کہ حجاز کے محدثین یعنی ابنِ شہاب، یحییٰ بن سعید اور ابن جریج بھی اسی زمرے میں داخل ہیں، جو الفاظ و حروف کو من و عن کے بیان کرنے کے قائل ہیں۔ مالک بن انس کا بھی یہی مسلک تھا کہ حدیث و روایت میں الفاظ، حروف اور ترتیب کو بہرحال قائم رکھا جائے اور اس میں کسی نوع کے تغیر کو روا نہ رکھا جائے۔ یہ روایت باللفظ کی صورت ہے۔

اکثر روایات میں جو آنحضرتؐ سے منقول ہیں الفاظ و حروف کو بعینہٖ قائم رکھا گیا ہے یا باللفظ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تائید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ صحابہ و تابعین میں بعض حضرات کو اللہ تعالیٰ نے ایسا قوی اور غیر معمولی حافظہ بخشا تھا کہ ان کو الفاظ و حروف کے حفظ میں کوئی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔

ان کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ جب یہ احادیث کو سن لیتے تو یہ لوحِ قلب پر آپ سے آپ مرتسم ہو جاتیں۔ تاریخ میں اس نوع کے متعدد شواہد ملتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کو دیکھ لیجیے، ان کی مرویات و احادیث کا دائرہ کس درجہ وسیع ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ابن ابی ربیعہ کا قصیدہ، جو اسیؔ اشعار پر مشتمل ہے، ایک ہی بار سن کر یاد کر لیا تھا۔ زید بن ثابت نے نہ صرف بلوغت سے قبل ہی قرآن حکیم کا بیشتر حصہ حفظ کر لیا تھا، بلکہ ان سے متعلق یہ بھی مروی ہے کہ سترہ ہی دن میں عبرانی بھی سیکھ لی تھی۔ اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ حفظ و ذکا

کے معاملے میں نمونے کی حیثیت رکھتی تھیں اور اس امر کی متعدد مثالیں تاریخ و حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

تابعین میں نافع، ابن شہاب زہری، عامر الشعبی اور قتادہ بن دعامہ السدوسی بے نظیر حافظے کے مالک تھے۔ یہ صحیح ہے کہ روایات میں بسا اوقات مختلف طرق میں الفاظ و حروف کے اختلاف کا پتا چلتا ہے، لیکن ان کا تعلق ان اخبار روایات سے ہرگز نہیں، جو تعبدیات یا جوامع کلم کے زمرے میں شمار ہوتی ہیں، بلکہ ان روایات سے ہے جو کسی واقعہ یا مشاہدہ کی عکاسی کرتی ہیں۔ ظاہر ہے ان مواقع پر ہر راوی کو اظہار و بیان کے لیے اس مشاہدہ یا واقعہ کو اپنے ہی الفاظ کا جامہ پہنانا چاہیے۔ اس لیے ان مرویات میں محض الفاظ یا پیرایۂ بیان کے اختلاف کو مستبعد یا غیر طبعی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ان تصریحات کے پہلو بہ پہلو ایسی روایات بھی پائی جاتی ہیں، جن کو روایت بالمعنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ صحابہ اور تابعین میں بعض حضرات نے اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا کہ آنحضرتؐ کے ارشادات کا مفہوم و معنی بیان کرنے میں الفاظ کی پابندی نہ کی جائے، لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب ضرورت اس کی مقتضی ہو۔ مثلاً یہ کہ انھیں تیقن کے ساتھ یاد نہ رہے کہ آنحضرتؐ کے ٹھیک ٹھیک الفاظ کیا تھے؟ اس کے ساتھ وہ اس امر کی طرف یہ کہہ کر اشارہ بھی کر دیتے تھے کہ شاید آنحضرتؐ نے یہ الفاظ استعمال فرمائے، یا اس سے ملتا جلتا پیرایۂ بیان اختیار کیا حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے بارے میں مشہور روایت ہے کہ جب وہ یہ فرماتے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ بھی کہہ دیتے ھکذا، یا نحو ھکذا۔ یعنی اس طرح یا اسی قسم کے الفاظ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمائے۔ ان کے احساسِ ذمہ داری اور خشیتِ الٰہی کا یہ عالم تھا کہ جب حدیث بیان کرتے تو سارا جسم کانپ اٹھتا۔

حضرت ابو الدرداءؓ کی بھی یہ عادت تھی کہ جب حدیث کی روایت سے فارغ ہوتے تو اس بات کی تصریح ضرور کر دیتے۔ ھذا یا نحو ھذا۔ کہ یا تو یہ الفاظ

تھے اور یا اس سے ملتے جلتے۔

محمد بن سیرین کا کہنا ہے کہ انس بن مالک قلیل الروایۃ تھے، لیکن جب بھی حدیث بیان کرتے از راہِ احتیاط یہ ضرور کہہ دیتے - او کما قال۔ یعنی یا تو یہ الفاظ تھے، یا جس طرح حضور نے فرمایا۔

بعض صحابہ روایت بالمعنی کو جائز قرار دیتے تھے۔ اس کی تائید عروہ بن زبیر کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں انھوں نے کہا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میری مرویات لکھ لیتے ہو۔ عروہ بن زبیر نے کہا، جی ہاں میں آپ سے بھی سنتا ہوں، اور آپ کے علاوہ دوسرے اصحاب سے بھی۔ اور پھر اس حدیث کو قلم بند کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے پوچھا کہ میری روایت اور دوسروں کی روایت میں معنی و مفہوم کا اختلاف تو نہیں پایا جاتا۔ عروہ نے کہا جی نہیں۔ اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا:

لا باس بذٰلك۔

اس صورت میں حدیث بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس بارے میں اس سے بھی واضح یہ روایت ہے۔ محمد بن سیرین کا کہنا ہے:

ربما سمعت الحدیث عن عشرۃ کلھم یختلف فی اللفظ والمعنیٰ واحد۔

میں اکثر ایک ہی حدیث دس اصحاب سے سنتا، سب کا پیرایۂ بیان اگرچہ مختلف ہوتا، مگر معنی و مفہوم میں فرق نہ پایا جاتا۔

تحدث بالمعنی کی جن اصحاب نے اجازت دی، ان میں عبداللہ بن مسعود، ابودردا، انس بن مالک، عمرو بن دینار، عامر الشعبی، ابراہیم النخعی، ابن ابی نجیح، عمرو بن مرہ، سفیان بن عیینہ اور یحییٰ بن سعید القطان ایسی جلیل القدر شخصیتیں شامل ہیں۔

اس سلسلے میں ان حضرات کا موقف یہ تھا کہ خود قران حکیم نے ایک ہی واقعہ

کو باختلاف الفاظ متعدد جگہ بیان کیا ہے، مگر باایں ہمہ ان میں معنی و مفہوم میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اس لیے اگر احادیث کی روایت میں معنی و مفہوم کی یکسانی قائم رہے تو الفاظ کا اختلاف کوئی مضرت پیدا نہیں کرتا۔

روایت بالمعنی کی تائید آنحضرتؐ کے اس طرزِ عمل سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ اکثر اپنے سفیروں کو مختلف قوموں کی طرف رسائل و خطوط دے کر بھیجتے ظاہر ہے کہ یہ سفرا ان رسائل و خطوط کو ان لوگوں کی زبان ہی میں پیش کرتے اور اس بات کا خاص طور سے خیال رکھتے کہ ترجمے میں وہی الفاظ استعمال کیے جائیں جو آنحضرتؐ کے الفاظ سے قریب تر ہوں۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور ترجمے سے کام نہ لیتے تو اسلام کا پیغام ان لوگوں تک پہنچانا قطعی دشوار ہو جاتا۔

روایت بالمعنی کی اجازت سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ یہ تمام رواۃ کے لیے اذنِ عام کے مترادف ہے۔ صحابہ کو تو بلاشبہ یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ آنحضرتؐ کے ارشادات کو اپنے الفاظ میں بیان کریں، کیونکہ انھوں نے آنحضرتؐ کے فیضانِ صحبت سے استفادہ کیا تھا اور اسلام کی روح سے پوری طرح آشنا تھے، یہی نہیں احکام و مسائل کے پس منظر سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن صحابہ کے علاوہ جو رواۃ ہیں ان کے لیے ائمہ حدیث نے کچھ شرائط کا تعین کر رکھا ہے۔

الرامہرمزی کا کہنا ہے کہ امام شافعی نے اس محدث یا راوی کو روایت بالمعنی کی اجازت دی ہے جو دین میں ثقہ ہو۔ سچائی اور صدق میں مشہور ہو، عاقل ہو، اور زبان کے تیور پہچانتا ہو، تاکہ معنی و مفہوم کو ادا کرنے کے لیے، وہ جو الفاظ منتخب کرے ان کو کسی غلط محمل پر محمول نہ کیا جا سکے۔

الماوردی کا قول ہے:

ان نسی اللفظ جاز، لانہ تحمل اللفظ والمعنی وعجز عن اداد

احدھما فیلزمہ اداء الاٰخر لاسیما ان ترکہ قد یکون کتمًا للاحکام فان لم ینسہ لم یجز ان یوردہ لغیرہ لان فی کلامہ صلی اللہ علیہ وسلم من الفصاحۃ مالیس فی غیرہ۔

اگر راوی روایت میں سے کوئی لفظ بھول جائے تو اس کے لیے جائز ہے کہ اس کے بجائے دوسرا لفظ استعمال کرے، اس لیے کہ اس نے حفظ کے سلسلے میں لفظ و معنی دونوں کو ملحوظ و مرعی رکھا ہے، لیکن ان میں کا ایک حصہ چونکہ ذہن کی گرفت سے نکل گیا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے مترادف دوسرا لفظ استعمال کرے، ورنہ کتمانِ حق کا اندیشہ ہے، اور اگر وہ روایت کے الفاظ کو بھول نہیں پایا ہے تو اس کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ اصل لفظ کے بجائے دوسرا لفظ استعمال کرے، کیونکہ آنحضرتؐ کے کلام میں جو فصاحت پائی جاتی ہے، وہ دوسروں کے کلام میں پائی نہیں جاتی۔

علامہ سیوطی نے روایت بالمعنی کے بارے میں کہا:

ولاشك فی اشتراط ان لایکون مما تعبّد بلفظہ ...... وعندی انہ یشترط ان لایکون من جوامع الکلم۔

یعنی روایت بالمعنی کے جواز کے بارے میں جو یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ اس کے الفاظ تعبدیات سے متعلق نہ ہوں، یہ صحیح ہے ... لیکن میرے نزدیک اس چیز کو بھی شرط قرار دینا چاہیے کہ روایت آنحضرتؐ کے حکیمانہ اور جامع کلمات پر مشتمل نہ ہو۔

ظاہر یہ بحث اپنے موضوع کے اعتبار سے سراسر فنی ہے۔ دونوں مدرسۂ فکر کے حامل حضرات ایسے ہیں کہ جنھوں نے اپنے اپنے دور میں اشاعتِ سنت کی بھرپور کوشش کی ہے، اور اگر ہم یہ کہیں کہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی مخلصانہ جدوجہد ہی کا یہ ثمرہ ہے کہ احادیثِ رسول کا بہت بڑا ذخیرہ آئندہ نسلوں تک پہنچا، اور زندگی کا دستور العمل قرار پایا تو اس میں قطعی مبالغہ آرائی نہ ہوگی، بلکہ یہ اسلامی تاریخ اور شعور کی صحیح ترجمانی ہوگی۔ اور اب جب کہ یہ قیمتی

ذخیرہ صحاح ستہ میں پوری احتیاط اور چھان بین کے بعد عہد بہ عہد منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اور تدوین کی باقاعدہ شکل اختیار کر چکا ہے، روایت باللفظ، یا روایت بالمعنی کی بحث ختم ہو جانی چاہیے۔

لیکن بُرا ہو استشراق زدہ حضرات کا، کہ انھوں نے نہ صرف از سرِ نو اس بحث کو چھیڑا اور اچھالا ہے بلکہ اس سے غلط نتائج اخذ کرنے کی مذموم کوشش بھی کی ہے۔ حالانکہ ہم اس بات کی وضاحت بھی کر چکے ہیں کہ احادیث کا کثیر حصہ باللفظ ہی مروی ہے اور جہاں تک روایت بالمعنی کا تعلق ہے۔ اس کا وقوع بھی صدرِ اول میں ہوا اور وہ بھی عند الضرورت، اور اس احتیاط کے ساتھ، کہ معنی و مفہوم میں کوئی تغیر نہ رونما ہونے پائے۔

ظاہر ہے یہ وہ مبارک دور تھا، جب لوگ عربیت کا صحیح ذوق رکھتے تھے اور اس کے مختلف اسالیب کو خوب جانتے بوجھتے تھے، اور اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ آنحضرتؐ کا طریقِ تکلم کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس احتیاط کے باوجود روایت بالمعنی سے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں، لیکن محدثین نے ایک ایک روایت کو مختلف طرق کے ذریعے جس دقتِ نظر سے دیکھا اور جانچا ہے اور متن و رجال کے نقد و تفحص کے سلسلے میں جس علمی اور تحقیقی منہاج کی طرح ڈالی ہے، اس کے بعد احادیث کی حجیت و استناد کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

تدوینِ حدیث

اس سے قبل کے مباحث سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ صحابہ اور تابعین نے حدیث و سنت کی حفاظت و صیانت اور تعلیم و تعلم کے کس درجہ شوق و محبت کا ثبوت دیا اور کس طرح تسلسل کے ساتھ اس روایت کو قائم رکھا کہ آنحضرتؐ کے اعمال تقریرات اور ارشادات سے اسلامی معاشرے کو بہرحال بہرہ مند رکھا جائے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا چاہیے کہ یہ مساعی اگرچہ اپنی جگہ پہ نہایت قابلِ قدر اور مؤثر تھیں۔ اور ان سے بلاشبہ علم و معرفت کی وہ شمعیں روشن ہوئیں۔ جن کے ذریعے آیندہ چل کر پورا عالمِ اسلامی بقعۂ نور بن گیا۔ تاہم رسمی طور پر، اور حکومت کی سطح پر باقاعدہ تدوین حدیث کا آغاز حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے ہی میں ہو پایا۔ انھوں نے اپنے عامل ابوبکر بن حزم کو لکھا، جو مدینے میں تھا:

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ اوسنۃ ماضیۃ اوحدیث عمرۃ ماکتبہ فانی خفت دروس العلم و ذھاب اھلہ۔

دیکھو! آنحضرتؐ کی احادیث، یا سنت ماضیہ اور عمرۃ کی مرویات میں سے جو کچھ ملے اس کو قلم بند کرلو۔ کیونکہ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہے کہ مبادا علم مٹ جائے، اور اہلِ علم یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوتے چلے جائیں۔

عمرۃ سے مراد عمرۃ بنت عبدالرحمٰن الانصاریہ ہیں۔ انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسبِ فیض کیا تھا۔ ان سے متعلق کہا جاتا ہے کہ احادیثِ رسول کے بارے میں ان کو بہت دسترس حاصل تھی۔

اسی نوع کے مراسلات حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے تمام عمال کو بھیجے تھے، جن میں کتابت حدیث کی تاکید درج تھی۔ سب سے پہلے جنھوں نے

ان کی زندگی ہی میں اس پر لبیک کہا اور احادیثِ رسول کو ایک کتاب کی شکل میں ترتیب دیا۔ وہ عالم حجاز و شام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کی جمع کردہ احادیث کی نقول تمام بلادِ اسلامی میں بھجوا دیں۔ تاکہ مسلمان ان پر عمل پیرا ہوں، اور ان کی روشنی میں دینی زندگی کے خطوط متعین کریں۔

اول اول بعض صحابہ اور تابعین نے کتابتِ حدیث کو اس بنا پر مناسب نہ سمجھا تھا کہ کہیں قرآن کی حفاظت و صیانت معرضِ خطر میں نہ پڑ جائے اسی وجہ سے ان میں دو مختلف رائیں اُبھر آئیں۔ ایک گروہ علم حدیث کو قیدِ تحریر میں لے آنے کا حامی تھا، جبکہ دوسرے گروہ کا موقف یہ تھا کہ احادیث چونکہ سینوں میں محفوظ ہیں اور اسلام، معاشرے کی اساس بھی ہیں، اس لیے کتابت احادیث کی نہ صرف ضرورت نہیں، بلکہ یہ عمل فی نفسہٖ درست بھی نہیں معلوم ہوتا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں اختلاف رائے کی یہ نوعیت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور علما کی بہت بڑی تعداد نے یہ بات سمجھ لی کہ سنتِ رسول کی اشاعت و فروغ کے فریضہ سے عہد برآ ہونے کے لیے یہ لازم ہے کہ احادیثِ نبوی کو ایک ایک کر کے جمع اور مدوّن کیا جائے۔ یہاں تک کہ جو لوگ پہلے اس کے قائل نہیں تھے وہ بھی اب احادیث کو قلم بند کرنے کی افادیت کے قائل ہو گئے۔

کتابتِ حدیث کی یہ کوششیں بار آور ثابت ہوئیں، اور اس کے نتیجے میں اتباع تابعین کے دور میں مسانید، کی تالیف و تدوین کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے ابو داؤد الطیالسی نے طرح ڈالی۔ امام احمد بن حنبل کی مسند نسبتاً زیادہ جامع اور زیادہ وسعت لیے ہوئے ہے۔ مگر ان کا شمار اتباع تابعین میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کی وفات دو سو بیس ہجری کے بعد ہوئی۔

صحاح کی تدوین کا شرف اس دور کے لیے مقدر تھا جس میں امام بخاری مسلم، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ اور نسائی ایسے جلیل القدر محدثین پیدا ہوئے۔

انھوں نے احادیث کو ابواب کی ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔

متاخرین کے ہاں ان پر کوئی اضافہ نہیں ہو پایا۔ انھوں نے جو کچھ کیا، اس کو محض تہذیب، شرح اور اختصار کے عمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ابوعبداللہ الحمیدی نے پانچویں صدی ہجری میں صحیحین کو بترتیب مسانید مرتب کیا۔ ان کے بعد ساتویں صدی میں ابوالسعادات مبارک ابن الاثیر نے صحاح ستہ کو بترتیب ابواب جمع کیا۔ پھر نورالدین علی الہیثمی نے مجمع الزوائد میں، صحاح کے علاوہ جو مشہور مصنفات تھیں، ان کو یک جا کر دیا۔ ان کے بعد دسویں صدی ہجری میں السیوطی نے جامع الکبیر کے نام سے پچاس سے زیادہ مصنفات پر مشتمل ذخیرہ احادیث پیش کیا، اور اس کو ایک مجموعہ کی شکل میں ترتیب دیا۔ اس مجموعہ میں صحاح ستہ اور مسانید عشرہ بھی موجود ہیں۔

اس طرح حدیث وسنت کے یہ خزانے مختلف اور طویل مراحل سے گزرتے ہوئے موجودہ نفوس تک پہنچے۔

حدیث کے بارے میں فنِ جرح و تعدیل

امتِ مسلمہ نے حدیث کی اشاعت و فروغ کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں ان میں علمِ الجرح والتعدیل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس علم کا موضوع رواۃ ہیں۔ اس میں اس چیز سے بحث کی جاتی ہے کہ راویانِ حدیث کی امانت و ثقاہت کا کیا درجہ ہے؟ یا ان میں عدالت و ضبط کا کیا عالم ہے یعنی ان میں کوئی ایسا تو نہیں جو جھوٹ بولتا ہو یا غفلت و نسیان کا شکار ہو۔ یہ خالص اسلامی علم ہے دوسری قوموں کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں پائی جاتی یہ دراصل علماء و محدثین کی اس خواہش و آرزو کا ثمرہ و نتیجہ ہے کہ وہ صحیح اور غیر صحیح احادیث میں فرق و امتیاز کے حدود کو نکھاریں اور یہ بتائیں کہ احادیث کے وسیع تر ذخیرے میں کون اس لائق ہیں کہ ان پر استدلال و استنباط کی بنیاد رکھی جائے، اور کون ایسی ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جرح و تعدیل کے پیمانوں کو حرکت میں لانے سے قبل محدثین نے اپنے معاصرین کے احوال کا پوری طرح کھوج لگایا اور ان کے بارے میں ایک جچی تلی رائے قائم کی۔ اسی طرح جو لوگ ان کے معاصر و ہم زمان نہیں تھے ان سے متعلق باوثوق ذرائع سے معلومات فراہم کیں اور اس باب میں کسی لومۃ لائم کی پروا کیے بغیر اپنے اس مشن کو جاری رکھا، اور ہر ہر دور میں ان لوگوں کی نشاندہی کی جنھوں نے اس بارے میں حزم و احتیاط سے کام نہیں لیا، یا عدالت و مروت کے تقاضوں کا خیال نہیں رکھا۔ بعض لوگوں نے از راہِ غلط فہمی جرح و تعدیل کو غیبت کی ایک قسم قرار دیا چنانچہ امام بخاری سے ایک مرتبہ کہا گیا کہ کچھ حضرات آپ سے اس بنا پر خفا ہیں کہ آپ نے متعدد رجال کی کوتاہیوں کو برملا بیان کیا ہے۔ امام بخاری کا جواب یہ تھا کہ یہ طرزِ عمل ہوائے نفس کی بنا پر اختیار نہیں کیا گیا بلکہ ہم نے جو کچھ کہا ہے نقل و درایت کے

بل یہ کہا ہے اور اس سے مقصود سنتِ نبوی کا دفاع اور تحفظ ہے۔

اس فن کا آغاز کب ہوا؟ سیر و رجال کی کتابوں کے تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ صغار صحابہ مثلاً ابن عباس، عبادہ بن الصامت اور انس بن مالک کے دور سے رجال کی توثیق و عدم توثیق کا کام شروع ہو چکا تھا۔ صحابہ کے بعد تابعین میں سے سعید بن المسیب، شعبی اور ابن سیرین نے یہ فرض انجام دیا۔ اس کے بعد یہ رسم چلی نکلی اور شعبہ اور امام مالک نے اس کام کو آگے بڑھایا۔

قرن ثانی میں جن لوگوں نے الجرح والتعدیل میں شہرت حاصل کی ان میں معمر (۱۵۳ھ)، ہشام الاستوائی (۱۵۴ھ)، اوزاعی (۱۵۶ھ)، ثوری (۱۶۱ھ)، حماد بن سلمہ (۱۶۷ھ)، لیث بن سعد (۱۷۵ھ) کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان کے بعد ابن المبارک (۱۸۱ھ)، الفزاری (۱۸۵ھ) ابن عیینہ (۱۹۷ھ) اور وکیع بن الجراح (۱۹۷ھ) کا دور آتا ہے اور اس دور کے مشہور ترین اہلِ فن یحییٰ بن سعید القطان (۱۸۹ھ) اور عبدالرحمٰن بن مہدی (۱۹۸ھ) ہیں۔ ان کی رائے جمہور محدثین کے نزدیک محبت و سند کا درجہ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس شخص کی توثیق کی اسے ثقہ سمجھا گیا اور جس کی تضعیف کی اسے ضعیف قرار دیا گیا۔

اسی سے ملا ہوا طبقہ، جس میں اس فن کے بڑے بڑے ائمہ شامل ہیں، یزید بن ہارون (۲۰۶ھ) ابو داؤد الطیالسی (۲۰۴ھ)، عبدالرزاق بن ہمام (۲۱۱ھ)، ابو عاصم النبیل اور ابن مخلد (۲۱۲ھ) کا ہے۔

قرنِ ثالث میں اس فن سے متعلق باقاعدہ تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ ان میں پہلے پہل جن لوگوں نے خامہ فرسائی کی، ان میں یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) کا نام آتا ہے۔ ان کے بعد بخاری، مسلم، ابو زرعہ، ابو حاتم اور ابو داؤد سجستانی نے اس فن کی تکمیل کی۔

نویں صدی ہجری کے بعد تک جرح و تعدیل کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

جرح و تعدیل سے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں، ان کو تین خانوں میں تقسیم کیا جا

سکتا ہے۔

۱۔ وہ جن میں صرف ضعفا کا ذکر کیا گیا ہے، جیسے البخاری، النسائی، ابن حبان، الدارقطنی، عقیلی، ابن الجوزی اور ابن عدی کی تالیفات۔

۲۔ وہ جن میں صرف ثقات کا تذکرہ ہے، جیسے ابن حبان البستی کی کتاب الثقات اور ابن قطلوبغا (۸۷۹ھ) کی الثقات، خلیل بن شاہین کی کتاب الثقات۔

۳۔ وہ تالیفات جن میں ان دونوں سے متعلق اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس نوع کی کتابیں کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں، جیسے بخاری کی تواریخ ثلاثہ، کبیر، اوسط اور صغیر، ابن حبان کی الجرح والتعدیل، ابن ابی حاتم الرازی کی الجرح والتعدیل، یا طبقاتِ کبرٰے لابن سعد۔ ان سب میں بہترین اور جامع کتاب حافظ ابن کثیر کی التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل ہے۔

جرح و تعدیل کے نقطۂ نظر سے یہ سب برابر اور یکساں نہیں ہیں، ان میں بعض متشدد ہیں بعض متساہلین اور بعض متوسط اور بین بین۔ متشددین میں ابن معین، القطان اور ابو حاتم الرازی ایسے حضرات ہیں۔ متساہلین میں الترمذی، الحاکم اور ابن مہدی کا شمار ہوتا ہے۔ اور وہ ائمۂ حدیث جنھوں نے اعتدال و توسط کی راہ اختیار کی ان میں بخاری، امام محمد اور مسلم کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے۔

جرح کے بارے میں حافظ ابن کثیر نے کہا ہے کہ واضح اور مفصل ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس مسئلے میں کون اسباب و عوامل ہیں جو کسی راوی کی عدالت و مرتبۂ ثقاہت کو حقیقتاً متاثر کرتے ہیں، ان کے متعلق ائمۂ فن میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ جرح کے مفصل ہونے کی صورت میں یہ معلوم ہو سکے گا کہ جس شخص کو موردِ تضعیف ٹھہرایا گیا ہے، وہ فی الواقع اس کا مستحق ہے یا محض نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے اس کو جرح کا سزاوار ٹھہرایا جا رہا ہے۔

فتنہ وضع حدیث اور محدثین کی مساعی جمیلہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان خون ریز لڑائیوں سے جہاں مصالح ملی کو شدید نقصان پہنچا، وہاں سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ مسلمان مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئے اور ہر گروہ نے یہ چاہا کہ اپنے مسلک اور خواہشات و آرا کی تائید کے لیے احادیث اور سنتِ رسول سے مدد لے، اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح احادیث کے ذریعے چونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ ہر گمراہی اور بدعت کو حق بجانب ثابت کیا جا سکے، اس لیے وضع حدیث کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ متعدد حلقوں میں اس کام کا آغاز ہوا۔ عراق اس بارے میں زیادہ بدنام ہے۔ زہری کہا کرتے تھے کہ ہمارے ہاں جو حدیث ایک بالشت کی ہوتی ہے، وہ عراق میں پہنچ کر گز بھر کی ہو جاتی ہے۔ امام مالک اسی وجہ سے عراق کو دارالضرب یا ٹکسال کہا کرتے تھے، جہاں حدیثیں گھڑی اور وضع کی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے فضائل اشخاص کے بارے میں احادیث میں تحریف و تبدل کا عمل شروع ہوا۔ شیعی دائروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب اور ان کے استحقاقِ خلافت سے متعلق احادیث وضع کی گئیں، اور سنّی حضرات نے جواب آں غزل کے طور پر حضرت ابوبکر صدیق کے فضائل اور استحقاق خلافت کے بارے میں حدیثیں وضع کیں۔ حالاں کہ یہ بزرگ، ان کی خوبیاں، فضائل اور درجہ و مرتبہ کی بلندی ایسی چیزیں نہ تھیں کہ جھوٹ اور کذب کی مرہونِ منت ہوتیں۔ ان کے کارنامے، ان کی بصیرت، علم و تقویٰ روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں اور تاریخ کے اوراق میں درج ہیں۔ وضع حدیث کی سازش میں متعدد عناصر نے حصہ لیا، لیکن

ان میں سر فہرست زنادقۂ فارس ہیں۔ ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ ان تمام عناصر اور عوامل کی نشان دہی کرنا مناسب سمجھتے ہیں جنھوں نے اس فتنے کو بھڑکایا اور وضع حدیث کے منصوبے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

زنادقۂ فارس

ابنائے فارس کے دلوں میں اس وقت آتشِ انتقام بھڑکی جب انھوں نے دیکھا کہ اسلام نے انھیں ہر میدان میں شکست دی ہے اور لوگ فوج در فوج اسلام کے پرچم تلے جمع ہو رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کے لیے عساکرِ اسلام کا مقابلہ آسان نہ تھا، اور نہ یہ ممکن تھا کہ اسلام کی فائق تر تہذیب کے مقابلے میں مجوسیّت کو کھڑا کیا جا سکے، اس لیے یہ لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اسلام کے خدوخال کو بگاڑا جائے اور اس میں داخل ہو کر اس پر وار کیا جائے۔ آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کی دو ہی صورتیں ان کے سامنے تھیں۔ یا تو یہ کہ قرآن حکیم سے تعرض کیا جائے اور اس میں تحریف و تبدل کی کوئی تدبیر اختیار کی جائے لیکن یہ اس لیے ممکن نہ تھا کہ قرآن محفوظ تھا، اور ہزاروں سینے اس کی ضوفشانیوں سے منور تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ احادیث کو اپنے مشئوم ارادوں کا ہدف ٹھہرایا جائے۔ یہ کام انھیں نسبتاً زیادہ سہل معلوم ہوا۔

انھوں نے کس نوع کی احادیث گھڑیں۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل روایات سے کیجیے:

خلق اللہ الملائکۃ من شعر ذراعیہ وصدرہ۔

اللہ نے فرشتوں کو اپنے سینے اور بازو کے بالوں سے پیدا کیا۔

انّ اللہ اشتکت عیناہ فعادتہ الملائکۃ۔

اللہ تعالیٰ آشوبِ چشم میں مبتلا ہوا تو فرشتوں نے عیادت کی۔

انّ اللہ لما خلق الحروف سجدت الباء ووقفت الالف۔

اللہ نے جب حروف کو پیدا کیا تو (با)، نے سجدہ کیا اور الف کھڑا ہو گیا۔

النظر الی الوجہ الجمیل عبادۃ۔

حسین چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔

ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس نوع کی مضحکہ خیز احادیث کو سنیں تو اسلام سے متنفر ہو جائیں اور اس کا مذاق اڑائیں۔

انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ عقائد، اخلاق، حلال و حرام اور طب کے بارے میں بھی سینکڑوں روایات کو اسلامی حلقوں میں رواج دینے کی کوشش کی۔ خلیفہ مہدی کے سامنے ایک زندیق نے اعتراف کیا کہ اس نے ایک سو کے لگ بھگ حدیثیں وضع کی اور پھیلائی ہیں۔ ابن العوجاء کو جب قتل کیا جانے لگا تو اس نے کھلے بندوں اقرار کیا کہ اس نے چار ہزار حدیثیں گھڑی ہیں، جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ کم بخت نے مرتے وقت بھی جھوٹ بولا ہے تاکہ محدثین کے حلقوں میں احادیث و روایات کے بارے میں عدمِ اطمینان کی لہر دوڑ جائے۔ بالآخر کچھ لوگ پکڑے گئے اور مارے گئے۔

عبدالکریم ابن العوجاء کو امیر بصرہ محمد بن سلیمان نے قتل کیا، بیان بن سمعان المہدی کو خالد بن عبداللہ القسری نے موت کے گھاٹ اتارا، اور محمد بن سعید المصلوب کو ابو جعفر المنصور نے موت کی سزا دی۔

واعظ و قصاص

وضع و افترا کے عمل کو واعظوں اور قصہ گوؤں کے طرزِ عمل سے بھی تقویت پہنچی۔ ان لوگوں کے دل خوفِ خدا سے خالی تھے، یہ شہرت کے بھوکے تھے۔ ان کا مشغلہ یہ تھا کہ مختلف مقامات پر مجالس آراستہ کریں، اور لوگوں کو عجیب و غریب حدیثیں سنا سنا کر کبھی رلائیں اور کبھی ہنسائیں۔ یہ جھوٹ بولنے میں کس درجہ جسور تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے رصافہ میں

نماز ادا کی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک واعظ ان کے حوالے سے بیس اوراق پر مشتمل ایک حدیث بیان کر رہا ہے۔ دونوں نے از راہِ حیرت ایک دوسرے کی طرف دیکھا ــــ جب مجلسِ وعظ سے واعظ صاحب فارغ ہوئے تو یحیٰی بن معین نے کہا، میں یحیٰی ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہیں۔ ہم دونوں نے نہ اس حدیث کو کبھی سنا اور نہ دیکھا۔ اس پر اس نے کہا، کیا دنیا میں تم ہی یحیٰی بن معین اور احمد بن حنبل ہو۔ میں نے سترہ ایسے اشخاص سے روایت کی ہے، جن کا نام یحیٰی بن معین اور احمد بن حنبل ہے۔

سیوطی نے "تحذیر الخواص عن اکاذیب القصاص" میں تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ واعظ اور قصہ گو حضرات کیا کیا جھوٹ بولتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک صاحب کے بارے میں کہا ہے کہ وہ عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً کی تفسیر یوں بیان کرتا تھا کہ مقام محمود سے مراد عرشِ الٰہی ہے، اور یہ یبعثک سے مقصود یہ ہے کہ آنحضرتؐ خدا کے ساتھ عرش پر بیٹھیں گے۔

محمد بن جریر الطبری کو معلوم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئے اور اپنے گھر کے دروازے پر لکھ دیا:

سبحان لیس لہ انیس ولا لہ علی عرشہ جلیس۔

یعنی خدا پاک ہے، نہ تو اس کا کوئی انیس ہے اور نہ عرش پر اس کے ساتھ کوئی بیٹھنے والا ہے۔

اس پر بغداد کے عوام نے ان کے مکان پر سنگ باری کی اور سخت احتجاج کیا۔

عبادہ وصلحا

ان لوگوں نے نیک نیتی کے ساتھ حدیثیں وضع کیں۔ ان کا خیال تھا کہ لوگ چونکہ دین سے دُور ہو چکے ہیں، دلوں میں گداز نہیں رہا، اور غفلت اور دنیا کی محبت نے آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہیں، اس لیے ایسی احادیث وضع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، جن سے لوگوں میں عبادت وطاعت کا جذبہ اُبھرے، رقت و

گداز پیدا ہو اور لوگ پھر سے اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ چنانچہ انھوں نے ترغیب وترہیب اور رقاق سے متعلق کثرت سے روایات وضع کیں۔ ان سے جب کہا جاتا کہ آنحضرتؐ نے کذب وافترا سے روکا ہے، اور فرمایا ہے:

مَن کذب علیَّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہٗ من النار۔

جس نے میرے بارے میں جھوٹ بولا اس کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔

تو اس کے جواب میں یہ کہتے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کی مخالفت نہ کی جائے، نہ یہ ہے کہ دینی مصالح کے پیشِ نظر ایسی حدیثیں وضع نہ کی جائیں جن سے دلوں میں خدا کا خوف اور تقویٰ پیدا ہو، لوگ دین کی طرف لوٹیں اور دنیائے دوں سے متنفر ہوں۔

ان وضاعین میں سے ایک نوح ابن مریم تھا، جس نے اعتراف کیا کہ اس نے قرآن کے فضائل کے بارے میں حدیثیں گھڑی ہیں، اور ایک ایک سورت سے متعلق بتایا ہے کہ اس کی تلاوت سے کس درجہ ثواب حاصل ہوتا ہے۔ اس سے جب پوچھا گیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو اس کا کہنا تھا کہ میں نے جب دیکھا کہ لوگ فقہ ابو حنیفہ اور مغازی ابن اسحاق پر فریفتہ ہو رہے ہیں، اور قرآن کی تعلیمات سے غافل ہیں تو میں نے نیک نیتی سے ایسی احادیث گھڑیں اور پھیلائیں، کہ جن سے لوگوں کے دلوں میں قرآن سے شغف اور لگاؤ پیدا ہو۔

ایک اور بہت بڑے عابد وصوفی غلام خلیل تھے، جو لوگوں میں اس درجہ مقبول تھے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو بغداد کے تمام بازار ان کے سوگ میں بند ہو گئے۔ انھوں نے اوراد واذکار سے متعلق احادیث وضع کیں۔ اس سلسلے میں ان کا بھی یہی عذر تھا کہ انھوں نے دلوں میں تقویٰ ورقت پیدا کرنے کی غرض سے ایسا کیا ہے۔

یہ لوگ اسلام کے نادان دوست تھے، اور یہ نہیں جانتے تھے کہ وضع حدیث کا جرم کتنا گھناؤنا ہے اور اس سے احادیث کی صحت واستناد سے متعلق کس درجہ

شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔

متعصّبین

یہ وہ لوگ تھے جو عصبیت کے روگ میں مبتلا تھے۔ شعوبیوں نے عربی کی مخالفت میں اس نوع کی حدیثیں گھڑیں:

ان اللہ اذا غضب انزل الوحی بالعربیۃ واذا رضی انزل الوحی بالفارسیۃ۔

خدا جب ناراض ہوتا ہے تو عربی میں وحی نازل کرتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے تو فارسی میں وحی نازل کرتا ہے۔

جن لوگوں کو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ غلو کی حد تک محبت تھی، انھوں نے یہ حدیث وضع کی:

سیکون رجل فی امتی یقال لہ ابوحنیفۃ ھو سراج امتی۔

میری اُمت میں ایک شخص ابوحنیفہ نامی ہوگا جو میری اُمت کے لیے چراغِ راہ ثابت ہوگا۔

شوافع کے مخالفین نے اس انداز کی احادیث پیش کیں:

سیکون فی امتی یقال لہ محمد بن ادریس ھو احقر علی امتی عن ابلیس۔

میری امت میں ایک شخص محمد بن ادریس پیدا ہوگا، جو میری امت کے حق میں ابلیس سے بھی زیادہ حقیر ہوگا۔

اسی طرح کی احادیث مختلف شہروں، قبیلوں اور زمانوں کے بارے میں بھی گھڑی گئیں۔ علمائے حق نے ان سب موضوعات کی نشان دہی کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کو کن لوگوں نے وضع کیا اور کن عوامل سے متاثر ہو کر وضع کیا۔

جاہل فقہا اور متکلمین

فقہی اور کلامی اختلافات نے بھی جاہل اور فاسق وفاجر متکلمین کو موقع فراہم کیا

کہ وہ اپنے عقائد و نظریات کی تائید کے لیے موضوع احادیث کی آڑ لیں۔ چنانچہ جو لوگ اس بات کے قائل تھے کہ نماز میں رفع الیدین ممنوع ہے، انھوں نے یہ حدیث گھڑی:

من رفع یدیہ فی الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ لہ۔

جس نے نماز میں رفع الیدین کیا اس کی نماز نہیں ہوئی۔

خلقِ قرآن کے مسئلے میں محدثین اور معتزلہ میں شدید اختلاف رائے رونما تھا۔ محدثین اس بات کے قائل تھے کہ قرآن مخلوق نہیں ہے اور معتزلہ خلقِ قرآن کے حامی تھے۔ محدثین اور معتزلہ میں اس سلسلے میں علمی معرکہ آرائیاں بھی ہوئیں، جن میں محدثین کا پلڑا بھاری رہا۔ مسئلہ اصولی تھا اور اپنی آغوش میں خاصے دلائل رکھتا تھا لیکن ان دلائل پر اکتفا کرنے کے بجائے بعض جہلا نے اس نوع کی احادیث وضع کرنا شروع کر دیں:

من قال القراٰن مخلوق فقد کفر۔

جس نے قرآن کو مخلوق کہا، وہ کافر ہو گیا

سجیئ اقوام من امتی یقولون القراٰن مخلوق فمن قال ذٰلک فقد کفر باللہ العظیم وطلقت منہ امرأتہ من ساعتہا۔

عنقریب میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کو مخلوق قرار دیں گے، ایسا کرنے سے وہ کفر کے مرتکب ہوں گے اور ان کی عورتوں پر اسی وقت طلاق واقع ہو جائے گی۔

متملقین

اس گروہ نے خلفا کی خوشنودی مزاج کے لیے حدیثیں وضع کیں، تاکہ انھیں انعام واکرام سے نوازا جائے۔ خلیفہ مہدی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک مرتبہ کبوتر بازی میں مشغول تھا کہ اتنے میں غیاث بن ابراہیم آئے اور انھوں نے کبوتر بازی کی تائید میں ایک مشہور حدیث میں اضافہ کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ کبوتر بازی جائز ہے۔ خلیفہ رشید کے قاضی ابوالبختری کذاب نے یہاں تک کہہ دیا کہ (معاذ اللہ!):

ان النبی کان یطیر الحمام۔

آنحضرت کبوتر اڑایا کرتے تھے۔

اس پر خلیفہ سخت ناراض ہوا اور کہا:

اخرج عنی لولا انک من قریش لعزلتک۔

میرے ہاں سے نکل جاؤ، تم اگر قریش سے تعلق نہ رکھتے تو میں تمھیں معزول کر دیتا۔
خلیفہ نے اس کے برعکس یہ جانتے ہوئے بھی کہ غیاث جھوٹ بول رہا ہے، اُسے دس ہزار درہم بطور انعام کے دیے۔

مقاتل بن سلیمان البلخی نے تو مہدی کے سامنے باقاعدہ یہ تجویز رکھی کہ اگر آپ چاہیں تو میں عباس اور اس کے بیٹوں کے فضائل سے متعلق احادیث وضع کروں۔
مہدی نے جواب میں کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

دراصل بعض خلفا نے بڑے تساہل سے کام لیا، اگر یہ لوگ ان کے جرائم سے چشم پوشی اختیار نہ کرتے تو وضع حدیث کا فتنہ نہ پھیلتا۔ اللہ بھلا کرے محدثین کا، انھوں نے اپنے فرض کو پہچانا، اور کذب و افترا کے اس طوفان کو روکنے کی پوری پوری کوشش کی، اور یہ انہی کی مساعی جمیلہ کا فیض ہے کہ صحیح احادیث کا ذخیرہ موجودہ نسلوں تک پہنچ پایا۔

محدثین نے ہر ہر دور میں اس بات کا خیال رکھا کہ وضع حدیث کے فتنے کی روک تھام کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ جس پر فخر کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کی چھان بین اور نقد و تفحص کے سلسلے میں خالص علمی انداز کی طرح ڈالی، جس کی دوسری قوموں کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔
انھوں نے جن پیمانوں اور معیاروں کو حدیث کی جانچ پڑتال کے لیے پیش کیا، وہ یہ ہیں:

۱۔ اسناد: صحابہ آنحضرتؐ سے بلا محابہ حدیث روایت کرتے تھے، اور اس میں کوئی بھی شبہ کا اظہار نہیں کرتا تھا، کیوں کہ ان کا دامن کذب و افترا کی آلائشوں سے پاک تھا، تابعین بھی ہر اس روایت کو بلا کسی جھجک اور تامل کے قبول کر لیتے

تھے، جو صحابہ سے مروی ہو۔ لیکن جب فتنوں کا آغاز ہوا اور لوگ گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئے اور تعصب اور حمیتِ جاہلیہ نے بعض لوگوں کو جھوٹ اور وضع پر آمادہ کیا، تو احتیاط و تحفظ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ابن سیرین کا کہنا ہے پہلے اسناد کا رواج نہیں تھا، لیکن جب فتنوں نے سر اٹھایا تو صحابہ و تابعین نے حدیث کے معاملے میں زیادہ تثبت و احتیاط سے کام لینا شروع کر دیا، اور جب تک یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ راوی کون ہے؟ کس پایہ کا ہے؟ اور اس کی دینی حالت کیسی ہے؟ اس وقت تک روایت کو قبول نہ کیا جاتا۔

راوی کے متعلق خصوصیت سے یہ جاننا ضروری ہو گیا کہ اس کا تعلق اہلِ بدعت و ہویٰ سے تو نہیں ہے؟ صحابہ اس باب میں کس درجہ محتاط تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک مرتبہ بشیر العدوی حضرت ابن عباس کے پاس آئے اور ایک حدیث سنانا شروع کی، لیکن اس پر حضرت ابن عباس مطلقاً متوجہ نہ ہوئے۔ بشیر العدوی نے کہا، یہ کیا بات ہے کہ میں حدیثِ رسول سنا رہا ہوں اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔ حضرت ابنِ عباس نے جواب میں فرمایا:

اذا اسمعنا رجلاً یقول قال رسول اللہ ابتدرته ابصارنا و اصغینا الیه باذاننا فلما رکب الناس الصعب والذلول لم ناخذ عن الناس الا ما نعرف۔

پہلے ہماری حالت یہ تھی کہ جب کوئی حدیثِ رسول بیان کرتا، بے اختیار ہماری آنکھیں اس طرف اٹھ جاتیں اور کان متوجہ ہو جاتے، لیکن جب لوگوں نے حدیث کے معاملے میں عدم احتیاط سے کام لینا شروع کیا تو ہم نے مناسب سمجھا کہ صرف انہی احادیث کو قبول کریں جو ہماری جانی پہچانی ہیں۔

تثبت و احتیاط کے اسی اصول کو تابعین نے اختیار کیا، ان کے سامنے جب کوئی حدیث بیان کرتا تو یہ اسناد کا مطالبہ کرتے اور اس وقت تک مطمئن

نہ ہوتے جب تک صحابہ سے براہِ راست اس کی تصدیق نہ کر لیتے ۔ زہری کا قول ہے :

الاسناد من الدین ولولا الاسناد لقال فیہ من شاء بما شاء ۔

اسناد کا معلوم کرنا دین کا خاصہ ہے، کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو پھر ہر شخص حدیث کو جس طرح چاہے بیان کرے گا ۔

ابن المبارک کا کہنا ہے :

بیننا و بین القوم القوائم یعنی الاسناد ۔

ہم میں اور واضعین میں اسناد کا فرق ہے یعنی ہم اسناد کا التزام کرتے ہیں اور یہ اسناد کی پروا کیے بغیر سنی سنائی حدیثیں بیان کر دیتے ہیں ۔

۲ - توثیق : وضع و کذب کے فتنے کے بعد صحابہ، تابعین اور ائمہ حدیث زیادہ چوکس ہو گئے ۔ ایک ایک حدیث کی تلاش و تفحص کے لیے باقاعدہ سفر کرنے کا آغاز ہوا ۔ لوگ اس وقت تک کوئی حدیث یا اثر قبول نہیں کرتے تھے، جب تک صحابہ اور تابعین کی طرف رجوع کر کے اس کی تصدیق نہ کر لیں ۔ جابر بن عبداللہ ایک حدیث معلوم کرنے کے لیے شام پہنچے اور ابو ایوب نے مصر تک کی صعوبتیں برداشت کیں ۔ بشر بن عبداللہ الحضرمی کا کہنا ہے کہ میں طلب حدیث کی خاطر ایک شہر سے دوسرے شہر تک گھومتا پھرا ۔ مشہور صحابی ابو درداء کہتے ہیں کہ جب میں کسی آیت کے سمجھنے میں اشکال محسوس کرتا، اور مجھے معلوم ہوتا کہ برالغماد میں کوئی صاحبِ علم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں تو میں سفر کر کے ان کے ہاں پہنچتا ۔ بہت سے اسلاف سے مروی ہے کہ وہ ایک ایک حدیث کے لیے دور دراز علاقوں تک پہنچے ۔ سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ میں نے صرف ایک حدیث کی خاطر کئی دن اور راتیں سفر میں گزاریں ۔ ابی قلابہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ میں محض اس لیے ٹھہرا رہا کہ ایک شخص سے ایک حدیث سنوں ۔

طلبِ حدیث کے لیے سفر کرنے والے مختلف کیفیات کے حامل تھے ۔

انھیں رجال اور رجوال کے نام سے یاد کیا جاتا اور بدرجۂ غایت احترام سے یاد کیا جاتا۔
گولڈ زیہر نے تعصب کے باوجود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جن محدثین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے طلب حدیث کے جذبے سے متاثر ہو کر شرق و غرب کا سفر اختیار کیا ہے، انھوں نے کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا۔

۳۔ نقد رواۃ: محدثین نے سب سے بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ رواۃ کو اچھی طرح جانچا اور پرکھا۔ یہ معلوم کیا کہ رواۃ میں کون صادق ہے، کون کاذب ہے، کون صحت وصواب کے پیمانوں کے مطابق ہے اور کس میں ضعف واختلال ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے رجال کے حالات، سیرت اور تاریخ کا مطالعہ کیا، اور بغیر کسی خوف لومۃ لائم کے ہر راوی کے بارے میں صحیح صحیح رائے کا اظہار کیا، اور اس بات کی قطعی پروا نہیں کی کہ کون کس درجۂ شہرت کا مالک ہے جو لوگ حدیث کے معاملے میں کذب و افترا کے مرتکب ہوئے، ان میں ایک ایک کی نشان دہی کی، اور ایسے قواعد وضع کیے جن کی روشنی میں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس سے اخذِ روایت کرنا چاہیے اور کون اس لائق ہیں کہ ان کی روایت کو ترک کر دیا جائے۔

یحییٰ بن سعید القطان سے کہا گیا:

اما تخشیٰ ان یکون ھؤلاءِ الذین ترکت حدیثھم خصماءک یوم القیمۃ۔

کیا تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ جن لوگوں کی روایت کو تم نے ترک کیا ہے۔ وہ قیامت کے روز تم سے جواب طلبی کریں گے۔

ان کا جچا تلا جواب یہ تھا:

لان یکون ھؤلاءِ خصمی احب الی من ان یکون خصمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لم لم تذب عن حدیثی۔

یہ لوگ مجھ سے جواب دہی کریں، اس سے کہیں بڑھ کر یہ ہے کہ آنحضرتؐ مجھ سے جواب دہی کریں، اور پوچھیں کہ تم نے میری حدیث کا دفاع کیوں نہیں کیا۔

کن لوگوں کی روایات قابلِ اخذ نہیں، محدثین نے ان کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ **کذاب**: یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کذب و افترا سے کام لے کر آنحضرتؐ کی طرف غلط احادیث کا انتساب کیا۔ اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ ایسے لوگوں کی روایات شائستہ اعتبار نہیں، نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے ایک نوع کے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ ایک جماعت نے ان کو قتل کا مستحق گردانا ہے۔ اس میں اختلاف رائے ہے کہ ان کی توبہ قبول کی جائے یا نہ کی جائے۔ احمد بن حنبل اور ابوبکر الحمیدی بخاری کے شیخ کی رائے یہ ہے کہ توبہ کے بعد بھی ان کی روایات لائقِ قبول نہیں۔ امام نووی کا کہنا ہے کہ توبہ کے بعد ان کی روایات کو قبول کر لینا چاہیے۔

ابوالمظفر السمعانی کا قول ہے کہ جس شخص نے حدیث میں کبھی جھوٹ سے کام لیا، اس کی تمام روایات ساقط الاعتبار ہیں۔

۲۔ وہ لوگ جو عام معاملات میں جھوٹ سے کام لیتے ہیں، اس بارے میں محدثین کے حلقوں میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ جس نے ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولا اس کی روایت کردہ حدیث متروک ٹھہرے گی۔ امام مالک کا کہنا ہے کہ چار اشخاص کی روایت ساقط الاعتبار ہے:

جو سفیہ یا بے وقوف ہو۔

جو عام معاملات میں جھوٹ بولے۔

جو صاحبِ بدعت ہو اور بدعت کا داعی ہو۔

وہ شیخ جو اگرچہ زہد و تقویٰ میں شہرت رکھتا ہو، لیکن حدیث کو نہ پہچانتا ہو۔

۳۔ **اصحابِ اہواء و بدعت**: اس طبقے کی طرف محدثین نے خاص توجہ مبذول کی۔ اس سلسلے میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر اہلِ بدعت

کی روایات مسترد کر دینے کے قابل ہیں یا اس میں داعی اور غیر داعی کا فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اسی طرح ایک سوال ابھرتا ہے کہ ایک وہ شخص ہے جو اپنے مسلک و ایمان کے مطابق جھوٹ بولنے کو اکبر الکبائر گردانتا ہے۔ کیا ان دونوں میں امتیاز روا رکھا جائے گا یا نہیں؟ جہاں تک داعی اور غیر داعی کا تعلق ہے محدثین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اگر وہ ثقہ ہے اور اس کی روایت محدثین کی شرائط کے مطابق ہے تو مقبول ہو گی ورنہ نہیں۔ چنانچہ امام بخاری نے ابن حطان کی روایت نقل کی ہے، حالانکہ وہ کٹر خارجی تھا۔ امام شافعی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ خطابیہ کے سوا دوسرے اہلِ اہوا کی روایت بشرطِ صحت قبول کی جائے گی۔ امام عبدالقادر بغدادی نے "الفرق بین الفرق" میں تصریح کی ہے کہ امام بخاری نے آخر آخر میں اس رائے سے رجوع کر لیا تھا اور یہی صحیح بھی ہے۔ اہلِ بدعت کی روایت اس وقت خصوصیت سے مسترد کر دینے کے لائق ہو گی جب اس سے اس کے مسلک و خواہشات کی تائید ہوتی ہو۔ رہا دوسرا گروہ جو حدیث کے معاملے میں جھوٹ بولنے سے احتراز نہیں کرتا تو اس کی رائے بالاتفاق مسترد کر دینے کے لائق ہے۔

۴۔ فساق و مغفلین: مغفل ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو فہمِ حدیث پر قادر نہیں اور ان میں ضبط و اتقان اور عدالت و مروّت کی صفات پائی نہیں جاتیں۔ حافظ ابنِ کثیر کا کہنا ہے کہ مقبول راوی وہ ہے جو مسلم، عاقل، بالغ اور غیر مغفل ہو۔ اسی طرح جو لوگ فسق و فجور کے عادی ہیں، ان کی روایت بھی ناقابلِ اعتبار ہے۔ وضع و افترا کے دروازوں کو بند کرنے اور اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے محدثین نے دو عظیم الشان اقدامات کیے۔ ایک یہ کہ حدیث کے مراتب و درجات کی تعیین کر دی اور یہ بتایا کہ صحیح حدیث کون ہوتی ہے، حسن کسے کہتے ہیں اور ضعیف کا اطلاق کن روایات پر ہوتا ہے اور ان کی اقسام اور شاخیں کیا کیا ہیں اور اس علم کو اس دقتِ نظر، ژرف نگاہی اور جامعیت سے ترتیب دیا کہ

اس کے بعد کسی شخص کے لیے یہ امکان باقی نہیں رہا کہ آنحضرتؐ کے بارے میں غلط بات کہے اور محدثین کے حلقوں سے اوجھل رہے، یا وہ اسلامی معاشرے میں آسانی سے پذیرائی حاصل کر سکے۔

دوسرے یہ کہ وضع وافترا کی علامات کو استیعاب کے ساتھ بیان کر دیا تاکہ ان کی روشنی میں بیک نظر معلوم ہو سکے کہ کون روایات اصلی، صحیح اور درست ہیں اور کون ایسی ہیں جو زنادقہ اور اہلِ اہوائے کے فکر و نظر کی کجی کا نتیجہ ہیں۔

وضع وافترا کا عمل سند میں بھی رونما ہوا ہے اور متن میں بھی۔ سند میں جو علائم وکذب پر دلالت کناں ہیں۔ ان میں یہ اہم ہیں:

۱۔ راوی کذب میں مشہور ہو اور کوئی ثقہ راوی اس کی مرویات کی تائید نہ کرے۔ محدثین نے اس نوع کے ایک ایک کذاب کا تعاقب کیا ہے اور ان کی تاریخ و سیرت پر باقاعدہ روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ راوی خود اعتراف کرے کہ اس نے حدیثیں گھڑی ہیں اور ان کو عوام میں پھیلانے کی کوشش کی ہے، جس طرح کہ نوح بن ابی مریم نے کہا کہ اس نے سُوَر کے فضائل کے بارے میں حدیثیں وضع کی ہیں، یا عبدالکریم بن الوالعوجا نے تسلیم کیا کہ اس نے چار ہزار ایسی جھوٹی حدیثیں اسلامی معاشرے میں پھیلائی ہیں، جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ کوئی راوی ایسے شیخ سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات ثابت نہیں ہوتی، یا وہ پیدا ہی اس کی وفات کے بعد ہوا ہے۔ جیسے مامون بن امہر الہروی نے کہا کہ اس نے ہشام بن عمار سے یہ حدیث سنی ہے۔ اس پر حافظ ابن حبان نے پوچھا، تم شام کب گئے۔ اس نے کہا، دو سو پچاس ہجری میں۔ اس پر انھوں نے کہا وہ تو دو سو پینتالیس ہجری میں فوت ہو چکے تھے۔ یا جیسے عبداللہ بن اسحاق الکرمانی نے محمد بن ابی ایوب سے روایت کی۔ اس پر کہا گیا، کہ وہ تو تمھاری پیدائش سے نو سال پہلے انتقال کر چکے تھے۔

اس قسم کے کذب کو پہچاننے کے لیے رواۃ کی تاریخ ولادت کا جاننا ضروری ہے حفص بن غیاث الغازی کا کہنا ہے کہ جب تم کسی راوی کو متہم قرار دو تو اس سے تاریخِ ولادت کا مطالبہ کرو۔

رواۃ کے بارے میں نقد و تفحص کا یہ علم دراصل ضرورت کی بنا پر پیدا ہوا سفیان ثوری نے بہت صحیح کہا ہے کہ جب لوگوں نے کذب و افترا سے کام لینا شروع کیا تو ہمارے لیے ناگزیر ہوگیا کہ ہم ان سے تاریخ و سنین کا مطالبہ کریں اور پوچھیں کہ تم پیدا کب ہوئے؟ تم نے شیخ سے کب سماع کا شرف حاصل کیا؟۔

۴۔ کبھی کبھی راوی کی نفسیاتی کمزوریوں سے یا اس کے پیشے سے بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس نے حدیثِ رسول کے بارے میں وضع و افترا سے کام لیا ہے۔ سیف بن عمر التیمی کا کہنا ہے کہ ہم سعد بن طریف کے ہاں بیٹھے تھے کہ اتنے میں اس کا لڑکا روتا ہوا آیا اور شکایت کی کہ معلّم نے اسے پیٹا ہے۔ اس پر اس نے کہا، میں آج ہی اس سے انتقام لیتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے یہ حدیث گھڑی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

معلموا صبیانکم شرارکم اقلھم رحمۃ۔

تمھارے بچوں کو پڑھانے والے شریر ہوتے ہیں، اور ان میں رحم و محبت کا جذبہ کم تر ہوتا ہے۔

محمد بن الحجاج النخعی ہریسہ بیچا کرتے تھے۔ انھوں نے حدیث گھڑی کہ:

الھریسۃ تشد الظھر۔

ہریسہ پیٹھ کو مضبوط بناتا ہے۔

محدثین نے متن میں بھی وضع و افترا کے علائم کی نشان دہی کی ہے مثلاً:

۱۔ رکاکتِ الفاظ: اس کے معنی یہ ہیں کہ احادیث کے الفاظ پر غور کیا جائے۔ اور یہ دیکھا جائے کہ آیا یہ اس مرتبہ فصاحت و بلاغت پر فائز ہیں کہ ان کا انتساب

آنحضرتؐ کی طرف کیا جائے۔ اگر الفاظ ایسے ہوں کہ عام آدمی بھی جو عربی زبان کے اسلوب و انداز سے واقف ہے۔ ان کے استعمال سے شرماتا ہو تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایسے رکیک جملوں کو آنحضرتؐ کا کلام قرار دیا جائے، جو افصح العرب تھے۔

ابن حجر نے اس سلسلے میں اس وضاحت کو ضروری سمجھا ہے کہ وضع کی یہ صورت اس وقت وقوع پذیر ہوگی جب روایت باللفظ ہو۔ اگر روایت بالمعنیٰ ہو تو پھر سند پر غور کیا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ اس میں کس درجہ استحکام و استواری پائی جاتی ہے۔

الفاظ اور اسلوب بیان سے قطع نظر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ محدثین جنھوں نے احادیث کے مطالعہ میں عمریں کھپائی ہیں اور احادیث کے مزاج و نہج سے آشنائی حاصل کی ہے، اس ملکہ کی بنا پر جو ان میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے، حدیث کو سن کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ آنحضرتؐ نہیں فرما سکتے۔

البلقینی نے اس کو ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اُن کا کہنا ہے کہ فرض کیجیے ایک شخص کئی برس تک کسی کی خدمت میں رہتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مخدوم کن چیزوں کو پسند کرتا ہے اور کن چیزوں کو پسند نہیں کرتا۔ اب اگر کوئی دوسرا شخص اس کے تجربے کے خلاف کوئی بات بیان کرتا ہے تو وہ فوراً اس کو جھٹلا دے گا۔ ٹھیک اسی طرح جو شخص نبوّت کے تیور پہچانتا ہے آنحضرتؐ کی عادات و شمائل سے واقف ہے اور احادیث کی صحت و سقم سے باخبر ہے اس قابل ہو جاتا ہے کہ بیک نظر بھانپ لے کہ جو حدیث بیان کی گئی ہے، یہ کہاں تک صحیح کہلانے کا استحقاق رکھتی ہے۔

۲- فسادِ معنیٰ: اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کو عقل و خرد کے پیمانے قبول نہ کریں اور اس کی کوئی معقول تاویل نہ کی جا سکے۔ جیسے یہ مشہور ہے

کہ حضرت نوح کی کشتی نے سات دفعہ بیت اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم کے قریب دو رکعت نماز ادا کی۔ ایسی حدیث بھی موضوع ہوگی جو شہوت کے جذبات کو اکسانے والی ہو۔ جیسے یہ کہ:

النظر الی الوجہ الحسن یجلی البصر۔

حسین چہرے پر نظر ڈالنے سے آنکھوں میں جلا پیدا ہوتی ہے۔

حس و مشاہدہ کے خلاف بھی یار لوگوں نے حدیثیں گھڑی ہیں۔ جیسے:

لا یولد بعد المائتۃ مولود عند اللہ فیہ حاجۃ۔

ایک صدی کے بعد اللہ تعالیٰ کو کسی مولود کو پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایسی احادیث بھی وضع و افترا کے حکم میں داخل ہیں جو طب کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہوں۔ جیسے:

الباذنجان شفاء من کل داءٍ۔

بیگن ہر بیماری کا علاج ہے۔

فساد معنیٰ میں وہ واقعات بھی آتے ہیں جو قطعیات تاریخ اور سنت اللہ کے منافی ہیں، جیسے یہ حدیث ہے کہ عوج بن عنق کا قد تین ہزار ذراع تھا اور طوفانِ نوح صرف اس کے ٹخنوں تک ہی پہنچ پایا تھا، اور یہ کہ جب اسے بھوک ستاتی تو دوہا تھ ڈالتا، اور سمندر میں سے ایک مچھلی پکڑ لیتا اور سورج کی تپش سے بھون لیتا۔

بعض خرافات کو بھی بعض لوگوں نے حدیث کا نام دیا ہے۔ مثلاً یہ:

الدیك الابیض حبیبی وحبیب حبیبی جبریل۔

سفید مرغ میرا دوست ہے اور میرے دوست کا دوست جبریل ہے۔

علامہ ابن الجوزی نے اس سلسلے میں ایک صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے اور یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے:

کل حدیث رایتہٗ تخالفہ العقول وتناقضہ الاصول وتباینہ

النقول فاعلم انہ موضوع۔

ہر وہ حدیث جس کو تم دیکھو عقول سلیمہ کے منافی ہے، اصول صحیحہ کے خلاف اور نقول و نصوص سے متناقض ہے تو جان لو کہ یہ موضوع ہے۔

۳۔ تصریحاتِ قرآن کی مخالفت: وضع و افترا کی ایک اہم پہچان یہ ہے کہ حدیث تصریحاتِ قرآن کے خلاف ہو، اور اس کو کسی محمل پر محمول نہ کیا جا سکے۔ جیسے یہ حدیث ہے:

ولد الزنا لا یدخل الجنۃ الی سبعۃ ابناء۔

ولد الزنا سات پشتوں تک جنت میں نہیں جائے گا۔

حالانکہ قرآن میں ہے:

ولا تزر وازرۃ وزر اخری۔

اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

اسی طرح جو حدیث سنت متواترہ کے خلاف ہو وہ بھی موضوع قرار دی جائے گی۔ مثلاً ایک حدیث یہ بیان کی جاتی ہے:

اذا حدثتم عنی حدیثا یوافق الحق فخذوا بہ حدثت بہ ام لم احدث۔

جب کوئی حدیث میری طرف منسوب کی جائے، اور وہ حق کے موافق ہو تو اسے قبول کر لو، چاہے میں نے کہا ہو یا نہ کہا ہو۔

یہ اس متواتر حدیث کے خلاف ہے:

من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

جس شخص نے میری نسبت جھوٹ بولا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حدیث قرآن و حدیث کی روح کے خلاف ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے:

من ولد لہ ولد فسماہ محمداً کان ھو ومولودہ فی

الجنۃ۔

جس شخص کے ہاں لڑکا پیدا ہو اور وہ اس کا نام محمد رکھے تو وہ اور اس کا لڑکا دونوں جنت میں جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ اسلام نے نجات کی بنیاد اعمال و عقائد پر رکھی ہے، اسما و القاب پر نہیں۔

۴۔ حقائق تاریخی کی مخالفت: سعد بن سفیان اور معاویہ بن ابی سفیان کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اہلِ خیبر پر جزیہ عائد کیا حالانکہ خیبر کے زمانے میں جزیے کا تقرر نہیں ہوا، بلکہ جزیہ کی آیت عام تبوک کے بعد نازل ہوئی ہے۔ نیز یہ کہ سعد بن معاذ اس سے پہلے غزوۂ خندق میں فوت ہو چکے تھے، اور حضرت معاویہ فتح مکہ کے بعد اسلام کی آغوش میں آئے۔

اسی طرح حضرت انس کی طرف یہ حدیث منسوب کی جاتی ہے۔ کہ آنحضرتؐ حمام میں تہبند کے ساتھ نہائے، اور اس سے انھوں نے یہ استدلال کیا کہ بغیر تہبند کے حمام میں داخل نہیں ہونا چاہیے، جب کہ یہ واقعہ ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانے میں سرے سے حمام کا تصور ہی پایا نہ جاتا تھا۔

۵۔ راوی کے مسلک و نظریات کی تائید: حدیث نے صحیح حدیث کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ اس سے راوی کے خاص عقائد کی تائید نہ ہوتی ہو۔ مثلاً خلافت کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس میں کسی کے بارے میں بھی کوئی نص منقول نہیں ہے۔ اب ایسی حدیث موضوع ہوگی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اس سلسلے میں آنحضرتؐ نے کسی کا نام لیا ہے اور اپنے بعد خلافت کی ذمہ داریاں اس کو سونپی ہیں۔ کیونکہ اگر اس طرح ہوتا تو سقیفہ میں بحث و تمحیص نہ ہوتی۔ مزید برآں یہ مسئلہ اس درجہ اہم تھا کہ اس کو اسلامی معاشرے میں معلوم و مشہور ہونا چاہیے تھا، نہ یہ کہ کوئی مجہول راوی، کسی مجہول سے روایت کرے اور اس پر اعتبار کر لیا جائے۔

اس زمرے میں وہ احادیث بھی داخل ہیں جو اُن قوموں اور فرقوں کی تائید و

توثیق میں بیان کی گئی ہوں جو بعد میں پیدا ہوئے، جیسے مرجئہ وغیرہ۔

۶۔ ثواب و وعید کے بارے میں افراط: واعظ اور قصہ گو حضرات نے ایسی احادیث بھی بیان کی ہیں، جن میں معمولی عبادات کے بارے میں ثواب و فضائل کو حد سے بڑھا کر بیان کیا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں اس کے شوق کے دواعی میں اضافہ ہو۔ جیسے یہ حدیث ہے:

من صلی الضحیٰ کذا و کذا رکعة اعطی ثواب سبعین نبیًا۔

جس نے چاشت کی نماز کی اس اس انداز سے ایک رکعت ادا کی اس کو ستر نبیوں کا ثواب ملے گا۔

یہ ہیں وہ پیمانے اور اصول جن کی روشنی میں صحیح اور موضوع حدیث کی پہچان میں مدد مل سکتی ہے۔ اس سے مستشرقین کا یہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے کہ محدثین نے صرف اسناد اور اس کے ضعف اور استواریوں میں تو استیعاب کے ساتھ تعرض کیا ہے، لیکن ان عقلی معیاروں کو بیان نہیں کیا، جن سے معلوم ہو سکے کہ کون حدیث اہل اہوا اور زنادقہ کی بدنیتی کا نتیجہ ہے۔ ان پیمانوں کے علاوہ محدثین نے اس فنی ملکہ پر بھی اعتماد کیا ہے جو اُن لوگوں میں پیدا ہو جاتا ہے جن کو حدیث سے شغف ہے، جنھوں نے اس کی تعلیم و تعلم میں عمریں صرف کی ہیں اور آنحضرتؐ کی عادات و معمولات سے آشنائی حاصل کی ہے۔ یہ حدیث دیکھ کر بغیر اس کے کہ اس کی سند پر غور کریں، یہ کہہ دیتے ہیں:

ھذا الحدیث علیه ظلمة او متنه مظلم و ینکره القلب۔

یہ حدیث صاف نہیں، یا اس کا متن تاریک ہے، یا قلبِ سلیم اسے تسلیم نہیں کرتا۔

لیکن یہ استحقاق صرف انہی منجھے ہوئے اور فاضل محدثین کو حاصل تھا، جنھوں نے اشاعتِ سنت کو اپنی زندگی کا مشن ٹھہرایا۔ عام علما کے ذوق پر اس بارے میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ آنحضرتؐ افصح العرب تھے، اور

ان کے معمولات وشمائل حسنِ اعتدال کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔
اس بنا پر محدثین کے لیے محض ذوق اور ملکہ فنی کی بنا پر فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ جو حدیث پیش کی گئی ہے وہ کس درجے کی ہے۔
یہی مطلب ہے ربیع بن خثیم کے اس قول کا:
ان الحدیث ضوء کضوء النہار تعرفہ بہ وان من الحدیث ظلمۃ کظلمۃ اللیل تعرفہ بہا۔
بعض حدیثیں ایسی روشن ہوتی ہیں، جیسے دن، اور بعض حدیثیں ایسی تاریک ہوتی ہیں جیسے رات۔
قصہ گو واعظین اور زنادقہ نے جو موضوعات پھیلائیں، ان کی متعدد فقہا اور محدثین نے نشان دہی کی ہے۔ اس سلسلے میں جو کتابیں معرضِ وجود میں آئیں، ان میں چند یہ ہیں:

۱۔ الموضوعات الکبریٰ: عبدالرحمٰن بن علی بن محمد الجوزی کی تصنیف۔
۲۔ تذکرۃ الموضوعات: مصنفہ محمد بن طاہر بن علی بن احمد مقدسی۔
۳۔ اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ: مصنفہ حافظ جلال الدین سیوطی۔
۴۔ الاحادیث الموضوعۃ التی یرد العامۃ والقصاص: مصنفہ عبدالسلام بن عبداللہ ابن تیمیہ حرانی۔
۵۔ الباعث علی الخلاص من حوادث القصاص: مصنفہ زین الدین عبدالرحیم عراقی۔
۶۔ الموضوعات فی الاحادیث المرفوعات: مصنفہ جوزقانی
۷۔ تذکرۃ الموضوعات: مصنفہ جمال الدین محمد بن طاہر پٹنی۔
۸۔ الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ: مصنفہ قاضی شوکانی۔
۹۔ رسالۃ فی الموضوعات وکتاب الضعفاء: مصنفہ حسن بن الحسن

بن حیدر بن علی بن اسمٰعیل القرشی العددی عمری صغانی لاہوری۔

۱۰۔ اللامعۃ فی بیان کثیر من الاحادیث الشاعۃ : مصنفہ علامہ سخاوی۔

۱۱۔ اللآلی المنثور فی الاحادیث المشہور مما الفہ الطبع ولیس لہ اصل فی الشرع : مصنفہ ابن حجر عسقلانی۔

۱۲۔ کتاب الموضوعات الکبریٰ والصغریٰ : مصنفہ ملا علی قاری۔

اصطلاحاتِ حدیث

حدیث بنیادی طور سے دو خانوں میں انقسام پذیر ہے، یا تو مقبول ہے جسے محدثین کے حلقوں میں پذیرائی حاصل ہے، یا مردود ہے، جسے ان حلقوں نے شرفِ قبول نہیں بخشا۔ اسے ضعیف کہہ لیجیے۔ پھر ان دو قسموں کے تحت بہت سی اقسام مندرج ہیں اور صحت و سقم کے اعتبار سے ان کا حکم مختلف ہے۔

حدیثِ صحیح کی تعریف

اہلِ فن نے اس تقسیم پر "حَسَن" کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں: صحیح، حَسَن اور ضعیف۔ حَسَن کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ حدیثِ صحیح کی قسم ہے یا حدیثِ ضعیف کی۔ ذہبی نے امام بخاری اور مسلم سے یہ تصریح نقل کی ہے کہ حدیث حَسَن، صحیح کی قسم ہے اور امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ حَسَن اگرچہ ضعیف کی قسم ہے لیکن متروک العمل نہیں یعنی قیاس کے مقابلے میں اس پر عمل پیرا ہونا بہر حال مستحسن ہے۔ حَسَن کے متعلق تیسری رائے یہ ہے کہ یہ مستقل بالذات شے ہے، جو اگرچہ صحیح کے مرتبے پر تو فائز نہیں لیکن ضعیف سے قدرے فائق اور اعلیٰ ہے۔ ان اقسام ثلاثہ کے علاوہ اور بہت سی اقسام و انواع ہیں، جو کسی نہ کسی طرح انہی سے متعلق ہیں۔ ان سب کا استیعاب مشکل ہے۔ حازمی (ابو بکر محمد بن موسیٰ بن حازم الہمدانی) نے ان کی تعداد سو کے قریب بتائی ہے اور ابن الصلاح نے اپنی کتاب علوم الحدیث میں ان میں سے صرف پینسٹھ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ تقسیم کا یہ انداز حرفِ آخر نہیں۔ رواۃ اور متون کے احوال کے پیشِ نظر تقسیم و تنویع کا یہ سلسلہ بہت وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔

حدیث صحیح کیا ہے؟ اس کی تعریف اہلِ فن کے نزدیک یہ ہے کہ یہ حدیث مسند

سے عبارت ہے جس میں سلسلۂ اسناد ابتدا سے انتہا تک اس نہج کا ہو کہ عدل وضابط، عدل وضابط سے روایت کرے تا آنکہ اس کو آنحضرتؐ تک یا صحابی وتابعی تک لے جائے۔ نیز یہ کہ اس حدیث کو شاذ اور معلل نہیں ہونا چاہیے۔ اس تعریف میں چند نکات کی وضاحت ضروری ہے۔ حدیثِ مسند سے یہ مراد ہے کہ سلسلۂ اسناد، موصول و متصل ہو۔ چنانچہ حدیثِ مرسل جس میں صحابی ساقط ہو، وصفِ اتصال سے ساقط ہوگی۔ اس بارے میں مذہب راجح یہ ہے کہ اس کو ضعیف گردانا جائے گا، یہی حال روایت منقطع اور معضل کا ہے۔ کیونکہ ان کے سلسلۂ اسناد میں سے ایک یا دو شخص ساقط ہوتے ہیں، ان کو صحیح حدیث قرار نہیں دے سکتے۔ انقطاع کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ سند بہ ظاہر تو موصول و متصل ہو لیکن رواۃ میں کوئی ایک شخص ابہام لیے ہوئے ہو۔

۲۔ جب محدثین یہ کہتے ہیں کہ حدیثِ صحیح شاذ نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی ایسی روایت کی مخالفت نہیں پائی جاتی جو ثقات سے مروی ہو۔

۳۔ حدیث صحیح کے معلل نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں علت قادحہ نہ پائی جائے یعنی اس میں کوئی ایسا نقص وعیب نہ ہو جو قدح کا سبب بن سکے۔

۴۔ حدیث صحیح کے لیے رواۃ کا عادل وضابط ہونا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں کوئی راوی ایسا نہیں ہونا چاہیے جس میں عدالت وضبط کے تقاضوں کا فقدان ہو۔

عدالت کا اطلاق کن اوصاف پر ہوتا ہے، اس پر علما نے کافی غور وخوض کیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ عدالت ایسے ملکہ سے تعبیر ہے جو کبائر کے ارتکاب اور صغائر پر اصرار سے روکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عدالت سے مراد یہ ہے کہ راوی میں اطاعت و مروّت کا غلبہ ہو۔ غزالی نے اس کو استقامتِ سیرت سے تعبیر کیا ہے۔ اس پر الجوینی کا قول ہے کہ عادل وہ ہے جس کی خبر و اطلاع پر یقین کیا جا سکے۔ ظاہر ہے یہ محض عبارات کا اختلاف ہے۔ مقصد سب کا یہ ہے کہ راوی کی سیرت و کردار کو اس ڈھب کا

ہونا چاہیے کہ اس کے بارے میں کذب اور جھوٹ کا گمان نہ کیا جاسکے۔

صحیح حدیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صحیح لذاتہ اور ایک صحیح لغیرہ۔ صحیح لذاتہ اس حدیث کو کہیں گے جو بذاتِ خود قبولیت و پذیرائی کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو اور صحیح لغیرہ کے معنی یہ ہیں کہ حدیث بذاتِ خود تو اگرچہ حسن کے مرتبے کی ہے لیکن چونکہ دوسری روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے اس لیے یہ حسن کے دائرے سے نکل کر صحیح کے دائرہ میں داخل ہوگئی ہے۔

پھر جس طرح حدیث صحیح کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسند و متصل سے تعبیر ہے، اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق یا آحاد سے ہے یا تواتر سے جس کا تعلق آحاد سے ہو، اس کو احادی کہتے ہیں اور جس کا تعلق تواتر سے ہو اُسے تواتر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

حدیثِ متواتر

وہ حدیث صحیح جسے اتنی بڑی جماعت روایت کرے کہ اس پر کذب اور جھوٹ کا گمان نہ کیا جاسکے، متواتر کہلاتی ہے۔ بشرطیکہ اول سند سے لے کر وسط و آخر تک رواۃ کی کثرت جوں کی توں قائم رہے۔ رواۃ کی تعداد کس قدر ہو جس سے کہ تواتر ثابت ہوتا ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک تحدید نہیں کی جاسکتی بعض لوگوں نے تعداد کی تعیین کی ہے۔ مثلاً قرآن حکیم میں ہے:

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ۔ (النور: ۱۳)

یہ اپنی بات کی تصدیق کے لیے چار گواہ کیوں نہ لائے۔

اس سے یہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تواتر کے لیے کم از کم چار رواۃ کا ہونا ضروری ہے۔ آیاتِ ملاعنہ میں پانچ کا ذکر ہے۔ اس سے بعض نے یہ رائے قائم کی کہ رواۃ کی تعداد پانچ ہونا چاہیئے۔ بعض نے کہا کہ متواتر میں دس سے کم راوی نہیں ہونے چاہئیں، کیونکہ اس سے کم تعداد پر جمع کا اطلاق نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا کہ اصل تعداد بارہ ہے، کیونکہ قرآن میں ہے:

وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ط (المائدہ ۱۲:)

اور ان میں ہم نے بارہ سردار مقرر کیے۔

بعض کی رائے میں یہ تعداد کم ہے، ان کے نزدیک بیس راوی ہونے چاہئیں۔ ان کا استدلال اس آیت سے ہے:

اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ (الانفال:۶۵)

اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہے تو دو سو کافروں پر غالب رہیں گے۔

اسی طرح بعض نے چالیس اور بعض نے ستر رواۃ کا ہونا ضروری ٹھہرایا۔

لیکن جیسا کہ ابنِ حجر کا کہنا ہے کوئی خاص تعداد متعین نہیں، یہ سب اندازے ہیں، جن کا کوئی ثبوت پایا نہیں جاتا۔ متواتر کی دو قسمیں ہیں۔ متواتر لفظی اور متواتر معنوی۔ متواتر لفظی سے مراد جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، الفاظ کے تطابق کے لحاظ سے ایسی روایات ہیں کہ جن میں اوّل، وسط اور آخرِ سند تک رواۃ کی اتنی بڑی تعداد رہے کہ ان پر کذب یا جھوٹ کا گمان نہ کیا جا سکے۔

کیا حدیث کے موجود ذخائر میں متواتر لفظی کا ثبوت ملتا ہے؟ اس کے جواب میں اختلاف رائے ہے، ابن الصلاح کا کہنا ہے کہ جہاں تک مطابقت لفظی کا تعلق ہے، مشکل ہی سے کوئی حدیث متواتر کہی جا سکتی ہے۔ لیکن سیوطی، قاضی عیاض اور ابنِ حجر اس بات کے قائل ہیں کہ صحاح میں متعدد احادیث ایسی ہیں جنھیں متواتر کہا جا سکتا ہے۔ جیسے شق القمر کی حدیث، مسح علی الخفین کی حدیث۔ یا یہ حدیث:

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ فی النار۔

کہ جس نے میرے بارے میں کذب و افترا سے کام لیا، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

ابنِ حجر کی تصریح کے مطابق اس حدیث کے راوی چالیس سے زیادہ ہیں اور سب کے سب صحابی ہیں۔ یہی نہیں ان میں دس وہ صحابہ بھی شامل ہیں، جنھیں جنت کا سزاوار ٹھہرایا گیا ہے، یعنی عشرہ مبشرہ۔

متواتر معنوی میں یہ ضروری نہیں کہ الفاظ کا بعینہٖ تواتر و تطابق، روایت

کے ہر ہر طریق میں پایا جائے۔ بلکہ یہ کافی ہے کہ معنی کے لحاظ سے اس میں ایک طرح کا توافق ہو۔ اس نوع کی احادیث صحاح میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ سیوطی سے دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے کے بارے میں جو احادیث منقول ہیں، ان کی تعداد سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اسی طرح اور بھی متعدد احادیث ہیں جو معناً متواتر کے زمرے میں شامل ہیں۔

علمائے حدیث اس بارے میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتے کہ متواتر معنوی اول اول احادی ہو، پھر طبقہ اولی کے بعد طبقہ ثانیہ میں یہ مشہور و مستفیض ہو جائے۔ مثلاً: انما الاعمال بالنیات (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) ان احادیث میں شمار ہوتی ہے جنھیں علما نے متواتر معنوی کا درجہ دیا ہے۔ حالانکہ اس کے راوی صرف عمر ابن الخطاب ہیں، اور عمر بن الخطاب سے روایت کرنے والے صرف علقمہ ہیں۔ اسی طرح علقمہ سے تنہا ابراہیم التیمی نے روایت کی ہے اور تیمی کا ماخذ روات صرف یحیی بن سعید انصاری ہیں۔ اس طرح گویا یحیی بن انصاری سے اس حدیث کی شہرت و استفاضہ کا آغاز ہوتا ہے، جب کہ اس سے پہلے کا سلسلۂ اسناد سراسر احادی ہے۔

محدثین متواتر سے تعرض نہیں کرتے اس لیے کہ اس کا تعلق اسناد سے نہیں، یہ مسئلہ فقہا اور اصحابِ اصول کا ہے۔ محدثین صرف ان احادیث سے بحث کرتے ہیں، جن میں روات و مرویات سے بحث کی جا سکے اور یہ بتایا جا سکے کہ صحت و ضعف کے اعتبار سے ان کی حیثیت کیا ہے۔ متواتر میں، متن اور رجال پر گفتگو نہیں کی جاتی، کیونکہ یہ غیر مشروط اور متفقہ طور پر واجب العمل ہیں۔

احاد کے بارے میں البتہ اختلاف رائے ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کی صحت ظنی ہے، یا یقینی۔ نووی نے "التقریب" میں ان کو ظنی الثبوت گردانا ہے۔ مگر جمہور محدثین کی رائے یہ ہے کہ جو احادیث صحیح بخاری اور مسلم میں آ گئی ہیں وہ سب قطعی اور یقینی ہیں۔ ابنِ حزم نے اس سے اتفاق نہیں کیا، ان کے خیال میں صحیح بخاری اور مسلم کی قید بے معنی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر وہ خبر موجب علم و عمل ہے، جو

عادل وضابط رواۃ سے مروی ہو۔

حدیثِ غریب

حدیث صحیح کی اس قسم کو غریب کہتے ہیں جس میں کوئی ثقہ راوی منفرد ہو۔ غرابت کا اطلاق کبھی متن کے اعتبار سے ہوتا ہے اور کبھی اسناد کے اعتبار سے۔

حدیث مشہور

مشہور وہ حدیث صحیح ہے جس کو ثقہ سے بہت سے لوگ روایت کریں۔ یہ متواتر سے کم درجے کی ہوتی ہے۔

حدیثِ عزیز

اس حدیث صحیح کو عزیز کہتے ہیں جس میں سلسلۂ اسناد میں دو راوی ہوں۔ یہ عجیب بات ہے کہ بعض لوگوں نے حدیثِ صحیح کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ وہ عزیز بھی ہو۔

امام بخاری وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے خالصتاً صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام کیا۔ ان کی تالیف میں ارسال، انقطاع، بلاغات کے قبیل کی کوئی چیز پائی نہیں جاتی۔ ہاں یہ البتہ ممکن ہے کہ ان کے ہاں "تعالیق" پائی جاتی ہیں۔ لیکن تعالیق اصل کتاب کا حصہ نہیں۔ ان کو محض استشہاد کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ امام بخاری کے بعد دوسرے شخص امام مسلم ہیں، جنھوں نے اپنی تالیف میں اس معیار کو قائم رکھا۔ امام مالک اس زمرے میں شامل نہیں۔ کیونکہ ان کی تالیف میں مراسیل، مقاطیع اور بلاغات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

حدیثِ صحیح کے متعدد مراتب ہیں۔ ایک حدیث صحیح ہوتی ہے اور ایک صحیح تر۔ محدثین کی اصطلاح میں اسے اصح الحدیث سے تعبیر کیجیے۔ نووی نے حدیثِ صحیح کو درجات ومراتب کے اعتبار سے سات اقسام میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ جو روایات بخاری ومسلم دونوں میں پائی جائیں، ان کا درجہ نسبتاً بلند ہے۔

۲۔ جو صرف صحیح بخاری میں پائی جائیں۔

۳- جو صرف صحیح مسلم میں درج ہوں۔
۴- ان کے بعد وہ احادیث ہیں جو صحیحین کے معیار اور شرائط کے مطابق ہوں۔
۵- ان کے بعد احادیث کا وہ حصہ ہے جو امام بخاری کی شرائطِ روایت کے مطابق ہو۔
۶- پھر وہ احادیث ہیں جو صرف امام مسلم کے شرائط کے مطابق ہوں۔
۷- آخر میں صحیح احادیث میں ان روایات کا شمار ہوگا، جن کی تصحیح ان کے علاوہ دوسرے ائمہ حدیث نے کی ہو۔

صحیح حدیث کی تقسیم کا ایک انداز بلاد و امصار کے لحاظ سے متعین کیا گیا ہے۔ مثلاً اکثر علمائے حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ اہلِ مدینہ کی احادیث جسے دار السنۃ کہنا چاہیے، مستند اور صحیح ہیں۔

نقادانِ فن جب یہ کہتے ہیں کہ "ھٰذا احدیثٌ صحیحٌ"، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ حدیث سند اور متن دونوں پہلوؤں سے صحیح ہے۔ لیکن جب یہ کہتے ہیں کہ یہ صحیح الاسناد ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک سلسلۂ اسناد کا تعلق ہے، یہ قطعی صحیح ہے رہا متن کا معاملہ تو ہوسکتا ہے اس میں علت و شذوذ پایا جاتے۔ تصحیح کا محدثین کے ہاں ایک اسلوب یہ ہے کہ بعض احادیث کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

اصح شیٔ فی ھٰذا الباب۔

کہ اس باب میں یہ صحیح ترین حدیث ہے جو مل سکی ہے۔

اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اگرچہ یہ حدیث ضعیف ہے، تاہم اس میں ضعف کم ہے اور اس باب میں اس سے ارجح، فائق اور کوئی حدیث نہیں پائی جاتی۔

حدیثِ حسن

یہ حدیث کی وہ قسم ہے جس میں سند متصل اور موصول ہو، اور ناقل اگرچہ

وصفِ عدالت سے موصوف ہوتا ہم اس میں ضبط نسبتاً کم ہو۔ نیز یہ کہ اس میں علّت و شذوذ نہ پایا جائے۔ اس میں اور حدیثِ صحیح میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ جہاں حدیثِ صحیح میں راوی کا تام الضبط ہونا شرط ہے وہاں حسن میں اگر راوی خفیف الضبط ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ان دونوں قسموں میں چونکہ علّت و شذوذ نہیں ہوتا اس لیے دونوں ہی حجت و مستند ہیں اور دونوں کے مضمون کو بطور استدلال و استشہاد کے پیش کیا جا سکتا ہے۔

حَسَن کی دو قسمیں ہیں۔ حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ۔ لیکن جب مطلقاً کسی حدیث کو حسن قرار دیا جائے گا تو اس کے معنی حسن لذاتہ کے ہوں گے۔

حسن لذاتہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حسن ہونا ایسے امر کا باعث ہے جو اس کی ذات میں داخل ہے، خارجی شئی کی بنا پر نہیں، اس کو قریب قریب صحیح ہی سمجھا جاتا ہے، اگرچہ اس کے رجال میں ضبط و اتقان کا وہ عالم نہیں ہوتا، جو حدیثِ صحیح کے ساتھ خاص ہے۔

حسن لغیرہ سے مراد ایسی روایت ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں کوئی راوی مستور ہو۔ یعنی جس کی اہلیت اور عدم اہلیت متحقق نہ ہو۔ لیکن اس کا کوئی راوی مغفل، کثیر الخطا یا متہم بالکذب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تائید کسی متابع اور شاہد سے ہوتی ہو۔

جامع ترمذی میں دراصل پہلے پہل حسن کی تعریف سے تعرض کیا گیا ہے۔ خطابی نے بھی اس کی تعریف بیان کی ہے اور دونوں پر اس بارے میں نقد و جرح سے کام لیا گیا ہے۔ ترمذی نے حدیث کو حسن، صحیح اور ضعیف کے تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔

ضعیف کی ترمذی نے دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک وہ جس میں ضعف اس درجہ کا نہ ہو کہ اس پر عمل کرنا ممتنع ہو اور دوسری وہ جس کا ترک کر دینا ہی انسب و اولیٰ ہو۔ اوّل الذکر ترمذی کے نزدیک حسن کے مشابہ ہے اور ثانی الذکر واہی اور ناقابلِ اعتنا۔ ترمذی میں احادیث کے بارے میں ایک عام اسلوب یہ اختیار کیا گیا ہے کہ بعض

سے متعلق تو وہ کہتے ہیں کہ حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ، اور بعض کے بارے میں کہتے ہیں۔ حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ، ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، ورنہ گڑبڑ کا اندیشہ ہے۔ حَسَنٌ صحیحٌ کے معنی یہ ہیں کہ یہ مطلق حسن سے درجے میں بلند ہے لیکن صحیح سے کم درجے کی ہے۔ ان دونوں میں تطبیق کی کیا شکل ہے۔ حافظ ابنِ حجر نے اس کو اس مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ بعینہٖ اس طرح ہے جیسے راوی کے بارے میں کہا جائے "صَدُوْقٌ" اور کسی سے متعلق کہا جائے "صَدُوْقٌ ضابطٌ"، تو حرف "صدوق" کہنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا رتبہ صحیح بخاری کے رجال سے کم ہے۔ اور "صَدُوْقٌ ضَابطٌ" کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا وہی درجہ ہے جو صحیح بخاری کے رجال کا ہے۔ جس طرح ان دونوں میں تطبیق ممکن ہے، اسی طرح صحیح اور حسن میں تطبیق ممکن ہے۔

رہا یہ کہ ترمذی میں بعض اوقات حسن صحیح کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ غریب ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حدیث صحیح کبھی کبھی صرف ایک ہی طریق سے مروی ہو تو یہ صحیح کے درجے پر فائز ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متابعت کی صورت میں یہ خدشہ زائل ہو جاتا ہے کہ اس کے رواۃ میں کوئی سوءِ حفظ کا شکار رہے۔ یا اس پر اس کے ضبط و اتقان کی جہت سے کوئی اعتراض ابھرتا ہے۔ اس کی مثال یہ حدیث ہے:

لولا ان اشق علی امتی لامرتهم بالسواك عند كل صلاة۔

اگر میں امت پر اس کو گراں نہ خیال کرتا تو حکم دیتا کہ ہر نماز سے پہلے مسواک کر لیا کریں۔

یہ حدیث حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہے۔

یہ محمد بن عمرو سے مروی ہے، انھوں نے ابی سلمہ سے روایت کی، اور ابی سلمہ نے ابی ہریرہ سے۔ محمد بن عمرو تام الضبط نہیں۔ اگرچہ محدثین میں سے اکثر نے اس کی توثیق کی ہے لیکن اس حدیث کی تائید چونکہ دوسرے طرق سے بھی ہوتی ہے یعنی ابوہریرہ سے اور بہت سے لوگوں نے اس کی روایت کی ہے۔ جیسے

الاعرج بن ہرمز اور سعید المقری وغیرہ۔ اس لیے اس کو صحیح کے مرتبے کی حدیث سمجھا جائے گا۔ یہ درست ہے کہ حسن کی طرف پہلے پہل ترمذی ہی نے توجہ دلائی لیکن اس کے پہلو بہ پہلو، اس کے اوپر کے طبقہ اور مشائخ میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، جیسے امام بخاری اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کی تالیفات۔ ابن الصلاح کا کہنا ہے کہ حسن کی مثالیں زیادہ تر سنن ابو داؤد میں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ خود ان کا اپنا قول ہے کہ میں نے "اس میں احادیثِ صحیحہ کا ذکر بھی کیا ہے، جو صحیح کے مشابہ یا قریب ہیں اور جن روایات میں وہن وضعف پایا جاتا ہے، ان کی میں نے وضاحت کر دی ہے ـــــ لیکن جن احادیث کے بارے میں کسی وہن وضعف کی تصریح نہیں کی ہے، وہ بہرحال صالح اور استدلال وعمل کے لائق ہیں" اور بعض احادیث بعض کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہیں"۔

علامہ بغوی (حافظ عبدالرحیم بن حسین زین الدین بغدادی عراقی) نے مصابیح السنۃ میں، حسن اور صحیح میں جو باریک فرق ہے، اس کو اس طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ صحیح اس حدیث سے تعبیر ہے جو شیخین کے ہاں پائی جائے یا جس کی تخریج صرف مسلم کریں۔ باقی کتب میں جو احادیث ہیں، ان کو حسن کے زمرے میں شمار کرنا چاہیے۔

علامہ بغوی کی اس اپج پر اکثر لوگوں نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ اس نئی اصطلاح کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں پائی جاتی۔ خصوصیت سے ان کی رائے کو اس وجہ سے بھی تسلیم نہیں کیا گیا کہ خود انھوں نے اپنی کتاب مصابیح السنۃ میں اس بات کا التزام نہیں کیا کہ اس میں صرف احادیث صحیحہ کا اندراج کریں گے، بلکہ اس میں ایسی احادیث بھی لے آئے ہیں جن کے رواۃ عادل وضابط نہیں۔

نقادانِ فن جہاں حدیث کو صحیح اور حسن کے ناموں سے پکارتے ہیں، وہاں ان کے ہاں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اور اصطلاحیں بھی ہیں، جیسے جیّد، مجود، قوی ثابت، محفوظ، معروف، صالح اور مستحسن۔

ان اصطلاحات کی بوقلمونی کے باوصف سب اس حقیقت پر دلالت کناں

ہیں کہ ان القاب سے ملقب احادیث مقبول اور شائستہ استدلال ہیں، چاہے وہ صحیح کے زمرے میں داخل ہوں، چاہے حسن کے مرتبے اور درجے کی ہوں۔ حسن و صحیح کے بارے میں یہ جان لینا ضروری ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی وضاحت کر چکے ہیں کہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ جہاں تک سلسلۂ اسناد کا تعلق ہے یہ حسن یا صحیح ہے۔ رہا متن، تو ہو سکتا ہے کہ وہ معلل یا شاذ ہو۔ یہی مطلب ہے ان کے اس مشہور قول کا:

ماکل ماصح سنداً اصح متناً۔

یہ ضروری نہیں کہ جو حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہو وہ متن کے اعتبار سے بھی صحیح ہو۔

حدیثِ ضعیف

یہ حدیث کی تیسری قسم ہے، اس کی بہترین تعریف یہ ہے کہ یہ روایت کی اس نوع سے تعبیر ہے جس میں صحیح اور حسن کے پایہ کی روایت نہ قرار دیا جاسکے۔ کچھ لوگوں نے ان صفات کے فقدان کی رو سے ضعیف کو ۳۸۱ انقسام پذیر ٹھہرایا ہے، لیکن ان میں اکثر ایسی ہیں جو واقعی نہیں اور نہ ان کا کوئی متعین نام ہی تجویز کیا جاسکتا ہے۔ ابن الصلاح نے اس کی ۴۲ صورتوں کی نشاندہی کی ہے اور حافظ عراقی نے اس کی تائید کی ہے۔ ہم ان میں صرف ان اقسام سے تعرض کریں گے جو محدثین کے حلقوں میں معروف اور متداول ہیں۔

مُرسل

اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں راوی متعین صحابی کا نام لیے بغیر یہ کہہ دے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا، یا آنحضرتؐ نے بات کی۔ یا آپؐ کے سامنے یہ فعل ہوا، اور آپ نے اس پر سکوت فرمایا۔ مثلاً نافع یہ کہہ دیں کہ آنحضرتؐ نے یہ ارشاد فرمایا اور اس صحابی کا ذکر نہ کریں جن سے انھوں نے سنا۔

مراسیل حجت و مستند ہیں یا نہیں، اس کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ حفاظِ حدیث اور نقادانِ فن کا ایک طبقہ یہ رائے رکھتا ہے کہ مراسیل حجت نہیں، چنانچہ امام مسلم نے بھی اس طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اہلِ علم مراسیل کو حجت نہیں مانتے۔

اکثر علما کی رائے میں جہاں تک مراسیلِ صحابہ کا تعلق ہے، انھیں ضعیف نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ ایک صحابی نے بذاتِ خود آنحضرتؐ سے نہ سنا ہو بلکہ کسی دوسرے صحابی سے سنا ہو، جس کا سماع آنحضرتؐ سے متحقق ہو۔ اس صورت میں سلسلۂ اسناد میں اس صحابی کا مذکور نہ ہونا مضر نہیں۔ سیوطی نے کہا ہے کہ صحیحین میں مراسیل صحابہ کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے اس لیے ان کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ ہاں اگر صحابہ میں سے کوئی تابعی سے روایت کرے تو اس کے ماننے سے البتہ تامل ہو سکتا ہے، کیونکہ اس نوع کی احادیث یا تو موقوفات کے درجے کی ہیں، یا ان کا تعلق سراسر اسرائیلیات سے ہے۔

مراسیل کے کئی درجے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی مرسل حدیث وہ ہے جو ایسے صحابی سے مروی ہو جس کا سماع ثابت و متحقق ہو۔ اس کے بعد وہ مراسیل ہیں جن میں صحابی کی روایت تو ثابت ہو لیکن سماع ثابت نہ ہو۔ اس کے بعد وہ روایات ہیں جن کا تعلق مخضرمین سے ہو۔ تابعین میں سے سعید بن مسیب کے مراسیل کا ایک مقام ہے۔ ان کے بعد شعبی اور مجاہد کی مراسیل کا درجہ ہے۔

جہاں تک صغار تابعین کا تعلق ہے، جیسے قتادہ، زہری اور حمید الطویل۔ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ بالعموم ان کی روایات کا ماخذ تابعین ہی ہیں۔

مراسیل جب ثقات سے مروی ہوں تو ان میں بلاشبہ ایک گونہ قوت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن ان میں اور ان روایات میں جو مراسیل مسندہ کے قبیل سے ہیں۔ اگر تعارض پیش آئے تو مراسیل مسندہ کو استدلال کے اعتبار سے ارجح قرار دیا جائے گا۔

منقطع

منقطع اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے سلسلۂ اسناد میں ایک راوی ساقط ہو، یا اس میں ایسے شخص کا ذکر ہو جو مبہم ہو یعنی جس کی شخصیت متحقق نہ ہو۔ اس کو منقطع اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس میں سند کا اتصال و تسلسل قائم نہیں رہتا۔

اس کی مثال عام طور پر یہ حدیث بیان کی جاتی ہے:

ان ولیتموھا ابا بکر فقوی امین -

اگر تم ابوبکر کو خلیفہ مقرر کرو تو وہ قوی اور امین ہیں -

یہ حدیث عبدالرزاق سے مروی ہے اور عبدالرزاق نے ثوری سے روایت کی ہے، اور ثوری نے ابی اسحاق سے، اور اسحاق نے زید بن یثیع سے اور انھوں نے حذیفہ سے اس کو مرفوعاً نقل کیا ہے - اس میں ثوری اور ابی اسحاق کے مابین ایک راوی شریک ہے، جو ساقط ہے، اس لیے کہ ابی اسحاق سے براہِ راست سماع ثابت نہیں -

مبہم راوی کے سلسلے میں عموماً اس حدیث کو پیش کیا جاتا ہے:

اللھم انی اسئلك الثبات فی الامر -

اے اللہ میں جملہ امور میں تجھ سے ثبات قدمی کا طالب ہوں -

اس کو ابوالعلا بن عبداللہ بن الشخیر نے دو شخصوں کی وساطت سے شداد بن اوس سے روایت کیا ہے لیکن یہ دو شخص کون ہیں، اس کی تصریح سند میں مذکور نہیں -

معضل

معضل اس حدیث سے تعبیر ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں دو یا دو سے زیادہ راوی ایک ساتھ ساقط ہوں - اسے منقطع کی ایک نوع قرار دیا جاتا ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ہر معضل تو منقطع ہوتی ہے، لیکن ہر منقطع کا معضل ہونا ضروری نہیں -

تدلیس

تدلیس کی دو معروف قسمیں ہیں، تدلیس اسناد اور تدلیس شیوخ - تدلیس اسناد کا مطلب یہ ہے کہ راوی اپنے ایسے معاصر سے روایت کرے جس سے وہ ملا ہے، لیکن سماع ثابت نہ ہو - یا ایسے معاصر سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی، لیکن روایت سے یہ شبہ ابھرتا ہو کہ اس نے اسے سماع کے بعد نقل کیا ہے -

اس کی مثال علی بن خشرم کا یہ قول ہے کہ ہم سفیان بن عیینہ کے پاس بیٹھے تھے، انھوں نے ایک روایت بیان کی اور کہا کہ زہری نے یوں کہا ہے - اس پر ان

سے دریافت کیا گیا، کیا آپ نے اسے براہِ راست زہری سے سنا ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ مجھے عبدالرزاق نے بتایا، اور عبدالرزاق کو معمر نے، اور معمر کو زہری نے۔ سفیان بن عیینہ زہری کے معاصر ہیں اور ان کا لقا بھی ثابت ہے۔ اس پر بھی انھوں نے بجائے براہِ راست زہری سے روایت کرنے کے عبدالرزاق اور معمر کی وساطت اختیار کی، اور روایت کو اس انداز سے بیان کیا کہ گویا انھوں نے زہری سے خود سنا ہے۔ ممکن ہے تدلیس سے ان کی مراد تنوع ہو، تعمیہ نہ ہو، کیونکہ ان کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ کھلی ہوئی تدلیس سے کام لیں۔

ائمہ حدیث تدلیس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے، اس کے متعلق شعبہ کے اس قول سے اندازہ کیجیے:

التدلیس اخو الکذب۔

تدلیس کذب ہی کا بھائی ہے۔

ان کا یہ قول بھی ہے۔

لان ازنی احب الی عن ادلس۔

یعنی تدلیس زنا سے بھی بدتر ہے۔

امام شافعی اس شخص کی روایت کو مسترد کر دیتے ہیں جو تدلیس کا مرتکب ہو۔

جملہ علما کا کہنا ہے کہ اگر راوی سماع کی تصریح کر دے تو اس کی روایت تدلیس کے باوجود قبول کر لی جائے گی اور اگر تصریح نہ کرے اور ایسی عبارت استعمال کرے جو مبہم اور شک میں ڈالنے والی ہو تو اس کا رد کر دینا ہی اولیٰ ہے۔

حاکم نے تدلیس کے اعتبار سے اسلامی بلاد و امصار کا جائزہ لیا ہے اور کہا ہے کہ "حجاز حرمین، مصر، عوالی، خراسان، اصبہان، بلاد فارس و خوازستان اور ماوراءالنہر کے ائمہ حدیث کے ہاں تدلیس نہیں پائی جاتی۔ تدلیس سے زیادہ تر کوفہ نے کام لیا ہے۔ اہلِ بصرہ میں کم لوگوں نے تدلیس کا ارتکاب کیا ہے۔ اسی طرح علمائے بغداد میں بھی سوا ابوبکر محمد بن محمد بن سلیمان باغندی کے کوئی بھی تدلیس سے متہم نہیں۔ یہ پہلا شخص ہے جس

نے یہاں تدلیس کی طرح ڈالی۔

تدلیس الشیوخ کا مطلب یہ ہے کہ راوی شیخ کا نام لینے کے بجائے اس کے القاب و اوصاف کا ذکر کرے، مثلاً یہ کہ:

حدثنا العلامۃ الثبت

کہ ہم سے علامہ اور ثبت وعدل نے حدیث بیان کی۔ یا الحافظ، الضابط، یا ایسے شخص نے حدیث بیان کی جو حافظ و ضابط ہے۔

تدلیس الشیوخ میں وہ روایات بھی شامل ہیں، جو ایک ہی شخص سے مروی ہوں، لیکن ان کو مختلف ناموں سے پکارا جائے۔ ابن الصلاح نے اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً:

خطیب بغدادی اپنی کتابوں میں ابوالقاسم، عبید اللہ بن ابی الفتح اور عبید اللہ بن احمد بن عثمان الصیرفی سے روایت کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ یا حسن بن محمد الخلال، حسن بن ابی طالب اور ابی محمد الخلال سے روایت کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک ہی شخص ہے جو مختلف ناموں سے موسوم ہے۔ سفیان بن عیینہ کی طرح خطیب کے بارے میں بھی ان کی جلالت قدر کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ تدلیس سے ان کا مقصد تعمیہ نہیں بلکہ ایک ہی شخص کے مختلف ناموں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

بعض علما نے تدلیس کی کچھ اور قسمیں بھی بیان کی ہیں۔ مثلاً ایک تدلیس عطف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی یہ کہے: حدثنا فلاں و فلاں۔ حالانکہ اس نے اس دوسرے شخص سے نہ سنا ہو۔

ایک تدلیس سکوت ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ راوی سمعت یا حدثنا کہہ کر خاموش ہو جائے، اور پھر کسی راوی کا نام لے لے، حالانکہ اس سے اس کا سماع ثابت نہ ہو۔

انہی دو قسموں سے ملتی جلتی ایک قسم یہ ہے کہ راوی بعض شیوخ کا نام بربنائے

ضعف سلسلۂ اسناد میں سے حذف کر دے اور صرف ثقات ہی کا ذکر کرے۔ یہ تدلیس کی بدترین قسم ہے۔ ولید بن مسلم اس بارے میں بہت بدنام ہیں۔ یہ سلسلۂ اسناد میں سے اکثر اوزاعی کے ان شیوخ کا نام نہیں لیتے جو ضعف سے متصف ہیں۔ بلکہ صرف انہی شیوخ کا ذکر کرتے ہیں جو ثقہ ہیں۔ محدثین نے ان کی تدلیس کی توجیہات بھی پیش کی ہیں۔ ابو مسہر کا کہنا ہے کہ اگر یہ ثقات سے روات کریں تو روایت مقبول ہوگی ورنہ نہیں۔

تدلیسِ بلاد کو بھی انہی اقسام میں شمار کرنا چاہیے۔ مثلاً کوئی مصری کہہ دے: حدثنی فلاں بالاندلس۔ کہ فلاں شخص نے مجھ سے یہ حدیث اندلس میں بیان کی، اور اس سے مراد قرافہ کے قریب وہ مقام ہو جس کو اندلس کہا جاتا ہے۔ یا کہہ دے: حدثنی فلاں بما وراء النھر۔ اور اس سے مقصود نہر دجلہ ہو۔ اس طرح کی مشتبہ عبارات سے دھوکا ہوتا ہے کہ راوی نے طلبِ حدیث کے سلسلے میں باقاعدہ سفر کی صعوبتیں برداشت کی ہیں، حالانکہ یہ واقع کے خلاف ہے۔

معلل

معلل حدیث کی اس قسم کو کہتے ہیں، جو جہاں تک سند کا تعلق ہے صحیح ہو۔ لیکن اس میں کوئی ایسی علّتِ قادحہ پائی جائے جس کی وجہ سے یہ ناقابلِ اعتبار ہو جائے۔ کسی حدیث کی تعلیل بیان کرنا یا اس بات کی پردہ کشائی کرنا کہ اس میں یہ علّت و نقص ہے، علومِ حدیث کا ایک اہم شعبہ ہے، اور یہ وسیع تر اطلاع قوی تر حافظہ اور فہم دقیق چاہتا ہے۔ ابنِ حجر کا کہنا ہے کہ یہ علومِ حدیث میں نہایت غامض اور نازک علم ہے اور اس سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فہم ثاقب، حفظ واسع اور معرفت تامہ سے نوازا ہو۔ یعنی جو مراتب رواۃ سے آگاہ ہو، اور اسانید و متون کے فہم و ادراک کے معاملے میں پورا پورا ملکہ رکھتا ہو۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے کہ حدیث کی جانچ پرکھ ایک طرح کا الہام ہے۔ چنانچہ اگر تم کسی ایسے عالم سے جو کسی حدیث کی تعلیل بیان کر رہا ہو، یہ پوچھ بیٹھو

کہ اس پر تمھارے ہاں کیا دلیل ہے تو وہ دلیل پیش نہ کر سکے گا انھی سے دریافت کیا گیا کہ آپ جو حدیث سن کر کہہ دیتے ہیں یہ صحیح ہے اور یہ صحیح نہیں تو آپ کے سامنے کیا معیار ہوتا ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ تم بتاؤ کہ تم جب دراہم کو کسی نقاد کے پاس لے جاتے ہو اور وہ بیک نظر بھانپ لیتا ہے کہ اس میں کون کھرا اور کون کھوٹا ہے تو کیا اس وقت تم اس کی بات مان لیتے ہو یا یہ پوچھتے ہو کہ تمھارے ہاں کھوٹے اور کھرے کی پہچان کا معیار کیا ہے؟

یہ علم محدثین کے حلقوں میں بیٹھنے اور استفادہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ چونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ایک مشکل اور غامض فن ہے اس لیے اس پر تصانیف کا دائرہ بھی سمٹا ہوا ہے۔ اس موضوع پر جن لوگوں نے طبع آزمائی کی ان میں سرِ فہرست بخاری کے شیخ علی بن مدینی ہیں۔ ان کی کتاب کا نام "کتاب العلل" ہے۔ اسی عنوان سے خلال نے بھی ایک کتاب مرتب کی ہے۔ ابن ابی حاتم کی ایک کتاب بھی علل کی تشریح پر مشتمل ہے۔ اسی فن سے متعلق امام احمد بن حنبل کے ایک مخطوطے کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس باب سے متعلق ایک جلیل القدر اور بے نظیر کتاب ابو الحسن دارقطنی کی ہے، جس کے جامع ان کے شاگرد حافظ ابوبکر ابرقانی ہیں۔ ان کے علاوہ جن لوگوں نے علل کو نکھارنے کا فریضہ انجام دیا، ان میں امام بخاری، یعقوب ابن ابی شیبہ الساجی ابن جوزی اور ابن حجر کا نام قابلِ ذکر ہے۔

تعلیل کا تعلق چونکہ اسناد سے ہے، اور اس حقیقت کے جاننے سے ہے کہ کسی راوی نے وہم سے تو کام نہیں لیا، یا اس حدیث کو مرسل تو قرار نہیں دیا، جو سند کے اعتبار سے موصول ہے۔ یا مرفوع کو موقوف تو نہیں ٹھہرایا۔ یا ایسا تو نہیں ہوا کہ ایک کے اجزا میں کوئی دوسری حدیث شامل کر دی گئی ہو، اس لیے یہ نہایت مناسب ہے کہ مسند اور موصول احادیث میں علل کی نشان دہی کی جائے۔ جیسا کہ خود راوی کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنی مرویات کی علت بیان کر دے۔ حدیث معلل کو معلوم کرنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ تمام وجوہ روایت پر غور کیا جائے۔

رواۃ کے اختلافات پر نظر ڈالی اور ان کے ضبط و اتقان کی چھان بین کی جائے۔ یہی مطلب ہے علی مدینی کے اس قول کا:

الباب اذا لم تجتمع طرقه لم يتبين خلوه -

کہ جب تک تمام طرقِ روایت کا استیعاب نہ کیا جائے، یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس میں خلا اور غلطی کی نوعیت کیا ہے -

حاکم نے "معرفۃ علوم الحدیث" میں علل کی دس قسمیں بیان کی ہیں اور کہا ہے کہ باقی احادیث میں بھی انہی کی روشنی میں علل کی وضاحت کی جا سکتی ہے -

مضطرب

اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی روایات بایں طور متعدد اور مساوی درجے کی ہوں کہ ان میں کسی کو ترجیح نہ دی جا سکے - تعدد روایات کبھی تو ایک ہی شخص کی وجہ سے ہوتا ہے جب کہ وہ دو یا دو سے زیادہ مرتبہ روایت بیان کرے، اور کبھی رواۃ کی بنا پر۔ اگر ان روایات میں کسی روایت کو حفظ و ضبط، یا طول سماع کی بنیاد پر ترجیح حاصل ہو جائے تو اس صورت میں اس کا ضعف دور ہو جائے گا، اور یہ اضطراب کے دائرے سے نکل جائے گی - اضطراب کا تعلق اگرچہ متن سے بھی ہوتا ہے، لیکن اکثر و بیشتر اس کا اطلاق سند ہی پر ہوتا ہے -

اضطراب فی الاسناد کی مثال حضرت ابو بکرؓ کی یہ حدیث ہے :

قال رسول اللہ اراك شبت - قال "شيبتني هود و اخواتها"

حضرت ابو بکرؓ نے کہا، یا رسول اللہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ بوڑھے ہو رہے ہیں - آنحضرتؐ نے فرمایا، ہاں! مجھے سورۃ ہود اور اس کی اخوات نے بوڑھا کر دیا ہے -

دار قطنی نے اس حدیث کو مضطرب قرار دیا ہے کیونکہ یہ صرف ابی اسحاق سے مروی ہے لیکن متعدد انداز سے کسی نے اس کو ابی اسحاق سے مرسلاً روایت کیا ہے اور کسی نے موصولاً - یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا ماخذ مسند ابی بکر ہے - بعض نے اس کا ماخذ مسند سعد بتایا ہے، جب کہ بعض کی رائے میں اس کا تعلق مسند عائشہ سے ہے -

کے رجال سب کے سب ثقات میں سے ہیں، جن میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔

بظاہر اس نوع کے بارے میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگرچہ اس میں طرقِ روایت میں اختلاف و تعدّد پایا جاتا ہے لیکن اس کے رواۃ کا تعلق جب ثقات سے ہے تو کیوں نہ اس کو صحیح احادیث کے زمرے میں شمار کیا جائے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون طریق زیادہ صحیح اور لائقِ اعتماد ہے، اور کون طریق مرجوح اور لائقِ ترک ہے۔ لہٰذا یہ صحت کے بجائے ضعف پر دلالت کناں ہے، کیونکہ ان میں کوئی وجہ ترجیح پائی نہیں جاتی، جس کی بنا پر ایک کو راجح اور اصح قرار دیا جا سکے، اور دوسری کو متروک و مرجوح۔

اضطراب فی المتن کی مثال انس بن مالک کی یہ روایت ہے:

قال صلیت خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر و عثمان فکانوا یستفتحون "بالحمد للہ رب العٰلمین" ولا یذکرون بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ فی اوّل القرأۃ ولا اٰخرھا۔

ان کا قول ہے کہ میں نے آنحضرتؐ، ابوبکر، عمر اور عثمان کے پیچھے نماز پڑھی، یہ سب نماز کا آغاز الحمد للہ سے کرتے تھے اور ان میں کوئی بھی بسم اللہ نہیں پڑھتا تھا، نہ اوّل قرأت میں اور نہ آخر قرأت میں۔

اس حدیث میں، متن کا ٹکڑا کہ ان میں کوئی بھی بسم اللہ نہیں پڑھتا تھا۔ اضطراب لیے ہوتے ہے، کیونکہ بخاری اور مسلم کی متفقہ روایت یہ ہے:

فکانوا یستفتحون القراءۃ بالحمد للہِ رب العٰلمین ۝

سب قراءۃ کا آغاز فاتحہ سے کرتے تھے۔

اس میں بسم اللہ پڑھنے کی نفی مذکور نہیں۔ اس صورت میں بلاشبہ اس متفق علیہ حدیث کو مرجح قرار دیا جا سکتا تھا، لیکن ایک اور روایت نے اشکال پیدا کر دیا، جو حضرت انسؓ سے مروی ہے، اس میں ان کا کہنا ہے کہ بسم اللہ کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً آنحضرت سے کوئی روایت محفوظ و ثابت نہیں۔

مضطرب حدیث کو بہر حال ضعیف نہیں کہا جا سکتا۔ اگر اضطراب کے معنی صرف یہ ہوں کہ خود راوی یا اس کے باپ کے نام کے بارے میں اختلاف رونما ہے لیکن راوی بہر حال ثقات میں سے ہے تو اس صورت میں اسے صحیح یا حسن کی اقسام میں سے گردانا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہی اضطراب موجب ضعف ہوتا ہے، جو سند و متن سے متعلق ہو، سند اگر صحیح ہے، اور رواۃ ثقہ ہیں تو اگرچہ اس کو مضطرب ہی کہیں گے تاہم اضطراب کی یہ نوعیت اس کی صحت پر اثر انداز نہیں ہو گی۔

مقلوب

اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں راوی متن میں کسی لفظ کو بدل دے، یا نام و نسب کو تبدیل کر دے اور متقدم کو متاخر اور متاخر کو متقدم ٹھہرا دے۔ تقلیب کا یہ عمل کبھی متن میں ہوتا ہے اور کبھی سلسلہ اسناد میں۔

متن میں تقلیب کی مثال یہ حدیث ہے کہ سات اشخاص ایسے ہیں جو قیامت کے روز اللہ کے سایہ میں ہوں گے، ان میں کا ایک وہ ہے:

ورجل تصدق بصدقة اخفاها، حتىٰ لا تعلم يمينه، ما تنفق شماله۔

اور ایک وہ شخص ہے جس نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور اسے اس طرح پوشیدہ رکھا کہ اس کا دایاں ہاتھ یہ نہیں جان پایا کہ بائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

اس روایت میں ترتیب بدل گئی ہے۔ یعنی جو مقدم تھا وہ موخر ہو گیا ہے اور جو موخر تھا وہ مقدم۔ صحیحین میں متفق علیہ الفاظ یہ ہیں:

حتىٰ لا تعلم شماله ما تنفق يمينه۔

اس طرح پوشیدہ رکھا کہ اس کا بایاں ہاتھ نہیں جان پایا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

اسناد میں تقدیم و تاخیر یوں واقع ہوتی ہے کہ مثال کے طور پر کوئی راوی مرہ بن کعب اور کعب بن مرہ میں فرق روا نہ رکھے۔ حالانکہ ان میں باپ بیٹے کا رشتہ ہے خطیب نے اس موضوع پر اپنی کتاب رفع الارتیاب فی المقلوب من الاسماء والانساب

میں خصوصیت سے بحث کی ہے، اور بتایا ہے کہ کہاں کہاں رواۃ نے سلسلۂ اسناد اور اسما کی تعیین میں ٹھوکر کھائی ہے۔

تقلیب کی ان دونوں مثالوں میں ترتیب میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے، وہ سہو و نسیان کی وجہ سے ہوئی ہے، کیونکہ عمداً ایسا کرنا افترا پردازی کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی وضاع و واعظ سلسلۂ اسناد کو اس لیے بدل دیتا ہے کہ لوگوں کی اس خواہش کو پورا کرے کہ وہ ایک متعین شخص کی احادیث کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مثلاً اگر حدیث سالم بن عبداللہ سے مروی ہے جو مشہور ہے تو وہ اس کو نافع سے مروی قرار دے دیتا ہے، اس لیے کہ عوام نافع کی احادیث کو زیادہ رغبت سے سنتے ہیں۔

تقلیب کی ایک دلچسپ شکل یہ بھی ہے کہ بعض اوقات ایک محدث کے مبلغِ علم و عرفان کا جائزہ لینے کے لیے متون و رواۃ میں ردّ و بدل کیا جاتا ہے۔ خطیب بغدادی نے اس سلسلے میں ایک عمدہ مثال بیان کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امام بخاری جب بغداد تشریف لائے تو یہاں کے علما کے دل میں اس خواہش نے چٹکی لی کہ ان کو آزمایا جائے اور ان کے حفظ و اتقان کے جو چرچے ہیں، ان کے بارے میں تحقیق کی جائے۔ چنانچہ دس افراد پر مشتمل ایک مجلس ترتیب دی گئی اور اس کے سپرد یہ کام ہوا کہ یہ سو حدیثوں کو چنیں اور ان کے سلسلۂ اسناد کو اس طرح متغیر کر دیں کہ ہر ہر متن اپنے صحیح سلسلۂ اسناد سے محروم ہو جائے اور پھر ایک ایک کر کے ان احادیث مقلوبہ سے متعلق امام بخاری سے دریافت کیا جائے کہ وہ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں چنانچہ مقررہ وقت پر آزمائش و امتحان کے اس مرحلے کا آغاز ہوا۔ ان دس آدمیوں میں سے ہر ایک نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق امام بخاری سے ان سے احادیثِ مقلوبہ سے متعلق دریافت کرنا شروع کیا۔ ہر سوال کے جواب میں امام بخاری کا ایک ہی جواب تھا۔ لا اعرف۔ (میں اس سند کے ساتھ اس حدیث کو نہیں جانتا) یہاں

تک کہ سوال و جواب کا یہ سلسلہ ختم ہوا۔

اس کے بعد امام بخاری نے پہلی حدیث سے لے کر آخری حدیث تک ایک ایک کو لیا اور بتایا کہ یہ حدیث اس سلسلۂ اسناد کے ساتھ مروی ہے، اور یہ حدیث اس سلسلۂ اسناد کے ساتھ منقول ہے، اور اس طرح ان لوگوں نے جو اسناد و متون میں تبدیلی کی تھی، اس کا بھید کھل گیا — اس پر علمائے بغداد کو امام بخاری کی فضیلتِ علمی کا اعتراف کرنا پڑا اور ماننا پڑا کہ اس شخص کا حافظہ بلا کا ہے، اور یہ بجا طور پر اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ احادیث کے ضبط و اتقان کے معاملے میں اس کو سرخیل محدثین سمجھا جائے۔

احادیثِ مقلوبہ کو اس بنا پر ضعیف قرار دیا جاتا ہے کہ ان میں ضبط و اتقان کی کمی رونما ہوتی ہے، جس سے سامع غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

شاذ

حدیثِ شاذ کا اطلاق کن معنوں میں ہوتا ہے؟ اس کی تعیین دشوار ہے، اسی وجہ سے علما نے اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ عام طور پر اس میں دو چیزوں کو اہم خیال کیا جاتا ہے، تفرد اور مخالفت۔ یعنی کوئی ثقہ ایسی روایت بیان کرے، جس میں وہ متفرد بھی ہو، اور دوسرے ثقات کی مخالفت بھی کرے۔ ابنِ حجر نے شاذ کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ شاذ اس روایت کو کہتے ہیں جس میں ایک مقبول راوی اپنے سے اولیٰ راوی کی مخالفت کرے، اور کہا ہے کہ اس باب میں یہی تعریف قابلِ اعتماد ہے۔

امام شافعی کا کہنا ہے کہ شاذ ایسی حدیث کو نہیں کہتے، جسے ایک ثقہ راوی بیان کرے اور دوسرا نہ کرے۔ بلکہ شاذ کا اطلاق اس روایت پر ہوگا جس میں راوی ثقات کی مخالفت کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ امام شافعی کے نقطۂ نظر کے مطابق شذوذ میں صرف تفرد کا ہونا کافی نہیں، بلکہ تفرد کے ساتھ اس میں مخالفت کا پہلو بھی ہونا چاہیے۔

علمائے حجاز نے اسی تعریف سے اتفاق رائے کیا ہے۔ ابن الصلاح نے بھی اسی کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ تفرد کی صورت میں اگر راوی عادل، ضابط اور حافظ ہے تو اس کی روایت بہر حال مقبول ہوگی، کیونکہ بصورت دیگر ہمیں بہت سی روایات سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ یہی نہیں بہت سے مسائل، و دلائل و مآخذ سے محروم ہو جائیں گے۔

حافظ ابن قیم نے واضح الفاظ میں اس حقیقت کی تصریح کی ہے کہ شذوذ کے دائرے میں وہی روایات داخل ہیں، جن میں کہ راوی اپنی روایت میں ثقات کی مخالفت کرے۔ اگر وہ مخالفت نہیں کرتا بلکہ صرف تفرد اختیار کرتا ہے تو ایسی صورت میں گو اصطلاحاً اس کو شذوذ سے تعبیر کر لیجیے، لیکن یہ روایت مقبول ہوگی اور اس کا استرداد جائز نہ ہوگا۔

حاکم کی تعریف میں گھپلا ہے۔ ایک طرف تو وہ حدیثِ اسناد میں صرف تفرد کو اہم عنصر گردانتے ہیں اور اختلاف کا ذکر نہیں کرتے۔ دوسری طرف اس شرط کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ تفرد ایسا ہونا چاہیے کہ جس کسی متابع سے تائید نہ ہو سکے۔ اس شرط کو تسلیم کر لینے کی صورت میں ان کی تعریف اور امام شافعی کی رائے میں چنداں اختلاف نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اگر روایت کی تائید کسی متابع سے ہو جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ راوی نے ثقات کی مخالفت نہیں کی۔ اس طرح امام شافعی اور حاکم کی رائے میں ایک گونہ تماثل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ حدیث ہے:

حدثنا ابوبکر محمد بن احمد بن بالویہ۔ قال حدثنا موسی بن ھارون قال حدثنا قتیبة بن سعید قال حدثنا اللیث بن سعد عن یزید بن حبیب عن ابی الطفیل عن معاذ بن جبل ان النبی کان فی غزوة تبوک اذا ارتحل قبل زیغ الشمس اخر الظھر حتی یجمعھا الی العصر فلیصلیھا جمیعًا و اذا ارتحل بعد زیغ الشمس صلی الظھر والعصر ثم سار و کان اذا ارتحل قبل المغرب اخر المغرب حتی یصلیھما مع العشاء و اذا

اذا ارتحل بعد المغرب عجل العشاء فصلها مع المغرب۔

ہم سے ابوبکر بن احمد بن بالویہ نے حدیث بیان کی، ان کا کہنا ہے کہ ان سے موسیٰ بن ہارون نے حدیث بیان کی۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے قتیبہ بن سعید نے حدیث بیان کی، ان کا کہنا ہے ہم سے لیث بن سعد نے یزید بن حبیب سے روایت کی، اور انھوں نے ابوالطفیل سے، اور ابوالطفیل نے معاذ بن جبل سے روایت کی کہ آنحضرت غزوۂ تبوک میں جب سورج ڈھلنے سے قبل روانہ ہوتے تو ظہر کو مؤخر کر دیتے اور اس کو عصر کے ساتھ ملاکر پڑھتے اور جب سورج ڈھلنے کے بعد سفر کرتے تو ظہر و عصر ایک ساتھ ادا کر لیتے، اور اس کے بعد روانہ ہوتے، اور جب مغرب سے پہلے روانہ ہوتے تو مغرب کو مؤخر کر دیتے اور مغرب کے بعد سفر کرتے تو عشا میں تعجیل کرتے اور مغرب و عشا ایک ساتھ پڑھ لیتے۔

حاکم کا کہنا ہے کہ یہ حدیث معلول نہیں، اس کے رواۃ کا تعلق آئمہ ثقات سے ہے۔ یہ شاذ اس بنا پر ہے کہ اس متن اور اس سیاق کے ساتھ اصحاب ابوالطفیل سے کوئی روایت مروی نہیں — ابویعلی خلیلی نے حدیث شاذ کا اطلاق اس روایت پر کیا ہے، جس کی ایک ہی سند ہو، چاہے اس میں ثقہ کی مخالفت پائی جائے یا نہ پائی جائے۔ اگر اس میں ثقات کی مخالفت کا پہلو پایا جائے تو اس کے بارے میں توقف اختیار کیا جائے گا اور اس سے استدلال درست نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس میں مخالفت تو ہو مگر ثقات کی نہ ہو تو اسے رد کر دیا جائے گا۔ ابن الصلاح اور دوسرے علما نے شاذ کی اس تعریف کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں مطلقاً تفرد کا اعتبار کیا گیا ہے اور مخالفتِ ثقات کو ضروری نہیں قرار دیا گیا۔

منکر

منکر اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں راوی ضعیف ثقہ کی مخالفت کرے۔ اس اعتبار سے یہ شاذ سے مختلف شے ہوگی۔ کیونکہ شاذ کے رواۃ ثقہ ہوتے ہیں اور منکر کے ضعیف۔ اس کی مقابل حدیث کو معروف کہیں گے، اور شاذ کی مقابل حدیث کو محفوظ۔ مناکیر کے راوی ان احادیث کی مخالفت کرتے ہیں، جو معروف و مشتہر ہوں۔

جب کہ شاذ حدیث کے رواۃ نہ صرف ثقہ ہوتے ہیں بلکہ ثقاہت کے پہلو بہ پہلو اُن کا حافظ و ضابط ہونا بھی ضروری ہے۔

ابنِ حجر کا کہنا ہے کہ صحیح اور حسن میں زیادتِ الفاظ مقبول ہے بشرطیکہ یہ زیادت ارجح اور اولیٰ یا زیادہ اوثق رواۃ کے منافی نہ ہو۔ وجوہِ ترجیح میں کئی چیزیں داخل ہیں۔ مثلاً یہ کہ راوی زیادہ ضابط ہو یا اس کی کثرتِ روایت کو پیش کیا جا سکے۔ ان ترجیحات کی حامل حدیث کو محفوظ کہیں گے اور اس کی مقابل کو شاذ، لیکن اگر راوی ضعیف ہو، اور اس میں ثقہ کی مخالفت کا پہلو بھی پایا جائے تو یہ روایت منکر کہلائے گی، اور اس کی مقابل کو معروف کہا جائے گا۔

ابن الصلاح کی رائے میں منکر و شاذ مترادف اصطلاحیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے البردیجی کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ منکر وہ حدیث ہے جس کی روایت میں راوی منفرد ہو، اور جس متن کی وہ روایت کرے وہ طرقِ حدیث میں سے کسی طریق سے بھی معروف نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں البردیجی کے نزدیک منکر میں صرف تفرد کا اعتبار ہے۔ حالانکہ مطلقاً تفرد مردود نہیں ہوتا، بلکہ جب یہ تفرد ثقات کی مخالفت پر مبنی ہوگا تب مردود و شاذ ہوگا۔ لیکن اگر صورتِ حال یہ ہو کہ وہ روایت میں صرف ان معنوں میں تفرد ہے کہ اس کو اس کے سوا کسی اور نے روایت نہیں کیا تو دیکھا جائے گا کہ اگر راوی تفرد کے باوجود عادل و ضابط ہے تو اس کی روایت مقبول ہوگی، اور انفراد اس کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ لیکن اگر راوی کا عدل و ضبط محلِ نظر اور مشکوک ہو تو اس کو صحیح کے دائرے میں نہیں شمار کیا جائے گا۔

سیوطی نے منکر و شاذ کو مترادف نہیں قرار دیا۔ ان کے نزدیک ابن الصلاح اس بارے میں حق و صواب کی راہ سے ہٹ گئے ہیں، کیونکہ دونوں میں بیّن فرق پایا جاتا ہے۔

منکر کی مثال یہ حدیث ہے:

عن ابی اسحٰق عن العیزار بن حریث عن ابن عباس عن النبی صلی اللّٰہ

علیہ وسلم، من اقام الصلوٰۃ و اتی الزکوٰۃ وحج البیت وصام وقری الضیف دخل الجنۃ۔

ابی اسحاق سے روایت ہے، انھوں نے العیزار بن حریث سے روایت کی اور انھوں نے عباس سے، یہ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا، جس شخص نے نماز قائم کی، زکوٰۃ دی، بیت اللہ کا حج کیا اور مہمان نوازی کی، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

ابو حاتم کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اس لیے منکر ہے کہ دوسرے ثقات نے اس کو اسحٰق سے موقوفاً روایت کیا ہے۔

کیا احادیثِ موقوفہ یا مقطوعہ کو ضعیف سمجھا جائے گا؟

موقوف سے مراد ایسی روایات ہیں جو صحابہ سے منقول ہوں، چاہے وہ قولی ہوں یا تقریری ہوں یا فعلی۔ مثلاً راوی یہ کہے کہ عمر بن خطاب نے کہا، یا علی بن ابی طالب نے یوں کہا۔ یا فلاں فعل ابو بکر کے سامنے ہوا اور اس پر انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ایسی روایات کا درجہ وہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا جو احادیثِ مرفوعہ کا ہے لیکن کیا یہ روایات علی الاطلاق ضعاف کے دائرہ میں داخل ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں۔ اگر ان میں شرائطِ صحت یا شرائطِ حسن کا التزام کیا گیا ہے، تو ہم انھیں روایاتِ صحابہ تو بہر حال قرار دیں گے۔ رہا یہ سوال کہ کیا ایسی روایات پر عمل کیا جائے گا یا نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر احادیث اس نوعیت کی ہیں کہ ان کا تعلق رائے و اختیار سے نہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ انھیں قابلِ عمل نہ ٹھہرایا جائے۔ کیونکہ صحابہ کی عادت یہ تھی کہ جب تک وہ آنحضرتؐ سے کوئی بات براہِ راست سن نہ لیں، یا اس کی تحقیق نہ کر لیں، اپنی طرف سے شرعیات میں کچھ نہیں کہتے تھے۔ اس کی مثال عبد اللہ بن مسعود کی یہ روایت ہے:

من اتی عرافا اوکاھنا فقد کفر بما انزل علی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

جو عراف و کاہن کے پاس گیا، اس نے آنحضرت کی تعلیمات کا انکار کیا۔

یہ حدیث موقوف ہے لیکن اسلام کی روح توحید کے عین مطابق ہے۔ البتہ

جن صحابہ نے اسرائیلیات کی کثرت سے روایت کی ہے، جیسے کعب احبار وغیرہ، ان کی روایات کے ردّ و قبول میں احتیاط کی ضرورت ہے، یا جن روایات میں علاماتِ قیامت اور فتن آخر الزمان کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بیان کی گئی ہیں، ان سے متعلق محتاط رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یعنی ایسی موقوف روایات کی جانچ پرکھ کی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ ان کی اسناد یا متن میں کہیں تعلیل، شذوذ اور اضطراب تو پایا نہیں جاتا۔ کیونکہ کسی حدیث کا مطلقاً موقوف ہونا اس بات پر دلالت کرتا نہیں کہ یہ ضعیف بھی ہے۔

ان احادیث کو ہم مرفوع کے دائرے میں شمار نہیں کر سکتے جن کا تعلق آیات کی تفسیر سے ہے، اس لیے کہ تفسیر کے باب میں صحابہ نے اجتہاد سے کام لیا ہے یہی وجہ ہے کہ فروع مسائل میں ان کے ہاں اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کو اس بنا پر ترجیح حاصل ہو گی کہ ان کا تعلق صحابہ کے فہم و ذوق سے ہے۔

مقطوع اس حدیث کو کہتے ہیں جو تابعین سے منقول ہو۔ اس کے بارے میں امام ابوحنیفہ کی دو ٹوک رائے یہ ہے کہ:

ما جاء عن الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) فعلی الراس والعین وما جاء عن الصحابی تخیرنا منہ واما ما جاء عن التابعین فھم رجال ونحن رجال۔

جو آنحضرت سے مروی ہو وہ سر آنکھوں پر، جو صحابہ سے منقول ہو اس میں ہم قول مختار لیں گے، اور تابعین کی روایات کے بارے میں ہماری روش یہ ہے کہ ہم ان کے ردّ و اختیار کے معاملے میں آزاد ہیں کیونکہ وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حدیثِ مقطوع کو ضعیف گردانتے ہیں، اور اسے حجت قرار نہیں دیتے۔ اسی وجہ سے اصحاب رائے نے مقطوع کے مقابلے میں قیاس پر عمل کرنے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن اس باب میں صحیح اور متوازن رائے یہ ہے کہ مقطوعات کو مطلقاً رد نہ کیا جائے، بلکہ اس کی سند و متن کی تحقیق کی جائے۔

اگر ان مرویات کا تعلق اکابر تابعین سے ہو، جیسے سعید بن مسیب، شعبی، نخعی اور مسروق ——— تو ان کو اقوالِ تابعین کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے، کیونکہ یہ وہ حضرات ہیں جن کو صحابہ کی معاصرت کا شرف حاصل ہے۔

ضعیف احادیث کے بارے میں اس عبارت سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں کہ:

یجوز العمل بالضعیف فی فضائل الاعمال۔

فضائل اعمال سے متعلق ضعیف احادیث بھی قابلِ عمل ہیں۔

اس سے تعلیماتِ اسلامی میں بہت سی ایسی چیزیں داخل ہو گئیں، جن کی کوئی بنیاد اور اساس نہیں ہے۔ یہ عبارت دراصل صدائے بازگشت ہے، احمد بن حنبل، عبدالرحمٰن بن مہدی اور عبداللہ بن مبارک کے اس قول کی:

اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل ونحوھا تساھلنا۔

جب ہم حلال حرام کی بات کرتے ہیں تو روایات کے رد و قبول میں سختی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جب فضائلِ اعمال کی گفتگو کرتے ہیں تو روایت میں تساہل برتتے ہیں۔

لیکن ان بزرگوں کے اس قول کا صحیح حل تلاش نہیں کیا گیا۔ اصل میں وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جہاں حلال و حرام کا معاملہ ہو، ہم انتہا درجے کی احتیاط سے کام لیتے ہیں لیکن اگر بحث فضائل اعمال وغیرہ کی ہو تو ہم تحقیق و تفحص کے پیمانوں میں زیادہ سختی روا نہیں رکھتے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ فضائل اعمال کے بارے میں صحیح سے کم درجے کی روایات کو بھی ہم قبول کر لیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو حدیث متن و اسناد کے اعتبار سے ضعیف ثابت ہو چکی ہو اس کو شائستہ عمل قرار دیتے ہیں۔

اس بحث میں دو نکتے قابلِ لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ احادیثِ ضعیفہ کو دین کا ماخذ و مبنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ فضائل اعمال سے متعلق صحیح روایات

کا ذخیرہ کیا کم ہے، جو اُن کے ثبوت کے لیے ضعیف احادیث کی آڑلی جائے۔

جن لوگوں نے ضعیف احادیث کو بھی قابلِ عمل ٹھہرایا ہے، انھوں نے اس کے لیے تین شرطیں پیش کی ہیں:

۱- روایت میں شدید قسم کا ضعف نہ ہو۔

۲- روایت کسی ایسے کلی اور جامع حکم سے ہم آہنگ ہو جو کتاب و سنت سے ثابت ہو۔

۳- اس سے زیادہ قوی دلیل اس کے منافی نہ ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب کسی روایت کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ متن و اسناد کے اعتبار سے ضعیف ہے تو اس کو حدیثِ رسول کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ ہاں یہ البتہ درست ہے کہ اس نوع کی احادیث سے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت سے یہ اس طرح مروی ہے یا ہم تک یہ روایت اس طرح پہنچی ہے۔ یعنی بصیغۂ تمریض تو اس کو آنحضرت کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، جزم و یقین کے اسلوب میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حدیثِ رسول ہے۔

معنعن

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کے معنی ایسی روایت کے ہیں، جس میں روایت کا انداز یہ ہو "فلان عن فلان" یعنی فلاں راوی نے فلاں راوی سے روایت کی۔ اس کو متصل کے قبیل سے سمجھنا چاہیے، بشرطیکہ اس میں سہ گونہ شرائط پائی جائیں:

۱- رواۃ کی عدالت۔

۲- لقائے راوی کا ثبوت اور

۳- تدلیس سے برائت

صحیحین میں معنعن کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ بخصوصیت سے صحیح مسلم میں اس کا التزام زیادہ ہے کیونکہ امام مسلم نے رواۃ کی معاصرت کو کافی سمجھا ہے۔

بشرطیکہ وہ معتبر ہوں اور لقائے راوی کو صحت کی شرط قرار نہیں دیا۔ امام مسلم کی اس باب میں کسی نے تائید نہیں کی بلکہ اس پر تنقید کی ہے۔ ابن الصلاح کا کہنا ہے کہ مسلم نے جس قول کو مردود قرار دیا ہے، وہی ائمہ حدیث جیسے علی بن مدینی، اور بخاری کے نزدیک مقبول و مختار ہے۔ نووی نے اس سے بھی زیادہ صاف لفظوں میں کہا ہے کہ مسلم کی رائے پر محققینِ علوم حدیث نے بہت لے دے کی ہے، اور ان کی یہ رائے کمزور ہے اور اس بارے میں صحیح اور پسند رائے وہی ہے جس کو اس فن کے ائمہ نے تسلیم کیا ہے۔ یعنی صحت روات کے لیے صرف معاصرت روات کافی نہیں بلکہ راوی اور مروی عنہ میں لقا و تحدیث کا ہونا ضروری ہے۔

بعض نقادانِ فن نے معنعن روایت کو مرسل کے مترادف ٹھہرایا ہے اور اسے حجت نہیں مانا، لیکن ایک گروہ نے اس کے علی الرغم اس کو حجت تسلیم کیا ہے۔ ان کے نقطۂ نگاہ سے اگر مراسیل کا تعلق ان صحابہ سے ہو، جن کو کثرت سے شرفِ صحابیت حاصل ہو، جیسے حضرت عمر کی مراسیل ہیں، تو ان کو سماع و لقا ہی پر محمول کیا جائے گا، اور اس کی پروا نہیں کی جائے گی کہ انھوں نے "سمعت" کا لفظ استعمال کیا، یا قال رسول اللہ کہا، یا عن رسول اللہ کا پیرایہ بیان استعمال کیا۔ کیونکہ صحابہ متاخرین کی ان اصطلاحوں سے ناآشنا تھے۔ علامہ نووی نے تصریح کی ہے کہ معنعن احادیث کو مراسیل کے زمرے میں شمار کرنا غلط ہے۔

صحیح مسلم میں معنعن روایات کی کثرت کی یہ تاویل کی گئی ہے کہ مستخرجات میں بالعموم اور صحیح مسلم میں بالخصوص ایسے طرق کا بھی ذکر ہے، جن میں تحدیث و سماع کی تصریح موجود ہے۔

حافظ ابن حجر کی رائے اس سلسلے میں زیادہ جامعیت لیے ہوئے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کبھی تو معنعن روایت "حدثنا" کے مرتبے کی ہوتی ہے اور کبھی اس مرتبے کی نہیں ہوتی، جب کہ اس کا صدور ایسے راوی سے ہو جو مدلس ہے، اور کبھی اس سے مراد، ایسی روایت ہوتی ہے جو "اخبرنا" کے ضمن میں آتی ہے۔

اس سے اس کے اتصال کی نفی نہیں ہوتی، لیکن اس سے سماع کا ثابت ہونا بھی ضروری نہیں۔

حدیث مؤنن

حدیث مؤنن اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں راوی "حدثنا فلان ان فلاناً" کا لفظ استعمال کرے۔ امام مالک نے اسے معنعن کے ضمن میں شمار کیا ہے۔ جب کہ راوی "عن فلان انه قال کذا" کے انداز کے الفاظ استعمال کرے۔ البردیجی نے ایسی روایت کو انقطاع پر محمول کیا ہے۔ ہاں اگر کسی دوسرے طریق روایت سے سماع کی وضاحت ہو جائے تو اس صورت میں انقطاع زائل ہو جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ راوی تحدیث کے لیے مختلف پیرایۂ بیان سے کام لیتے ہیں اور اختلاف کا منشا محض عرف و عادت کا اختلاف ہے حقیقت کا اختلاف نہیں۔

علومِ حدیث

حدیث اپنی آغوشِ فنون پرور میں کن کن مباحث و مسائل کو لیے ہوئے ہے اس کا اندازہ اس فہرست سے ہوگا جو ہم پیش کر رہے ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ بھی ہوگا کہ محدثین نے علوم و معارفِ سنت کا کس دقتِ نظر اور وسعتِ ذہن سے مطالعہ کیا ہے۔ اس فہرست پر سرسری نظر ڈال لینے سے معلوم ہو جائے گا کہ محدثین اور نقادانِ فن نے کس جامعیت کے ساتھ ان تمام موضوعات کا جائزہ لیا ہے اور ان پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے، جن کے فہم و ادراک سے، حدیث و سنت کے ذخائر کو سمجھنے میں، اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے میں مدد مل سکتی ہے۔ فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ علوِ اسناد: ایک سند ہے جسے سلسلۂ رواۃ کی ایک کڑی کہنا چاہیے اور ایک سند کا عالی ہونا ہے۔ سند کے عالی ہونے کے معنی وہ نہیں جو عوام کے ذہن میں ہیں یعنی یہ کہ سلسلۂ روایت جس قدر مختصر ہوگا اور رواۃ کی تعداد جس قدر کم ہوگی، اسی نسبت سے اس میں علو ابھر آئے گا۔ اس کے برعکس علو سے مراد یہ ہے کہ کیا اس کو ایسے جلیل القدر محدث کا قرب حاصل ہے کہ جس کی ثقاہت، تثبت اور فقہ حدیث امورِ مسلم سے ہو، چاہے رواۃ کی تعداد زیادہ ہی ہو۔ اس کا تعین دراصل تعدادِ رواۃ کے بجائے فہم و ادراک سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس حدیث پر غور کر لیجیے:

اربعٌ من کن فیہ کان منافقاً خالصًا۔ ومن کانت فیہ خصلۃ منہن کانت فیہ خصلۃ عن نفاقٍ حتی یدعہا۔ اذا حدث کذب، واذا عاہد غدر، واذا وعد اخلف واذا خاصم فجر۔

چار چیزیں ایسی ہیں کہ جس میں پائی جائیں وہ پورا پورا منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک ہی پائی جائے، اس میں گویا ایک گونہ نفاق پایا گیا۔ یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے۔ یہ چار چیزیں یہ ہیں۔ جب کچھ بیان کرے تو جھوٹ بولے، اور جب معاہدہ کرے تو توڑ دے اور جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔ اور جب لڑائی جھگڑا کرے تو فجور یا گالی گلوچ سے کام لے۔

یہ حدیث صحیح مسلم میں ہے۔ اس کے رواۃ کی تعداد سات ہے، لیکن اس کے باوجود یہ علوِ سند سے موسوم ہے کیونکہ اس میں امام حدیث سلیمان ابن مہران اور اعمش سے روایت کی گئی ہے۔

اسی طرح ہر روایت جو عبدالملک بن جریج، عبدالرحمٰن بن عمر، اوزاعی، مالک بن انس، سفیان بن سعید الثوری، شعبہ بن الحجاج، زہیر بن معاویہ اور حماد بن زید ایسے ائمہ فن سے قریب تر ہوگی، عالی کہلائے گی۔

۲۔ سلسلۂ روایت میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ محدث کے صدق و تثبت کا کیا عالم ہے، حفظ و اتقان میں کیسا ہے؟ اس کے اصول کیا ہیں، کیا روایات میں محدثین کے اختیار کردہ اصولوں کا پابند ہے یا اس کے اپنے وضع کردہ اصول ہیں۔ اس میں غفلت و تہاون کی عادت تو نہیں پائی جاتی، یا ایسا تو نہیں کہ بدعات و خواہشات کا پیرو ہو۔ اور مزید برآں ان بدعات کا داعی بھی ہو۔ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ جن شیوخ سے یہ روایت کرتا ہے، ان کو اس نے دیکھا یا سنا بھی ہے یا نہیں۔ تحمل واداء کے وقت کیا اس کی عمر اتنی تھی کہ اس کے سماع پر اعتبار کیا جا سکے۔ سلف ان اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور رواۃ میں اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ راوی توحید کا قائل ہو، شریعت کا پابند ہو، اور سنت پر عمل پیرا ہو۔

۳۔ علوم حدیث میں، مسند کی پہچان بھی داخل ہے۔ اس لیے کہ محدثین کے حلقہ میں غیر مسند سے استدلال و احتجاج کے بارے میں اختلاف رائے

پایا جاتا ہے۔

حدیثِ مسند کے معنی یہ ہیں کہ راوی اپنے شیخ سے سنے اور اس سماع کی تصریح بھی کرے، اور یہ شیخ اسی طرح اپنے شیخ سے سنے اور روایت کرے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ آنحضرتؐ تک وسعت پذیر ہو۔ اس اسناد میں "اخبرنا عن فلاں" یا "رفعہ فلاں" کے الفاظ نہیں ہونے چاہئیں۔ بلکہ ایسے الفاظ ہونے چاہئیں۔ جو براہِ راست سماع پر دلالت کناں ہوں۔

۴۔ **موقوفات صحابہ:** علومِ حدیث میں علم کی یہ نوعیت بھی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ موقوفاتِ صحابہ کو اس وقت مسند کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، جب کوئی صحابی یہ بتائے کہ فلاں آیت فلاں موقع پر نازل ہوئی۔ بعض دفعہ ایک صحابی سلسلہ رواۃ میں اس کڑی کا ذکر نہیں کرتا جس سے اس کا مسند ہونا ثابت ہو سکے۔ لیکن دوسری روایت سے اس کا مسند ہونا ثابت ہو جاتا ہے جیسے روح بن قاسم نے اس حدیث کو موقوفاً روایت کیا ہے:

اذا لم تستحی فاصنع ماشئت۔ (جب تم بے حیا ہو جاؤ تو جو چاہو کرو)

لیکن ثوری اور شعبہ وغیرہ نے اس کڑی کی نشاندہی کی ہے جس سے یہ روایت موقوف کے دائرے سے نکل کر مسند کے دائرے میں داخل ہوتی ہے۔

۵۔ اس سے ملتی جلتی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک صحابی جس کی رفاقت و صحبت مسلّم ہے یہ کہے کہ ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم یوں کریں، یا ہمیں فلاں طرزِ عمل سے روک دیا گیا تھا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہم یوں کہا کرتے تھے۔ اس انداز کی احادیث بھی مسانید کے زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔ چنانچہ مسانید کے مؤلفین نے اس نوع کی احادیث کو اپنی تالیفات میں بیان کیا ہے۔

۶۔ صحابہ کے بارے میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ان کا تعلق کس طبقہ سے ہے۔ انھوں نے آنحضرتؐ کو کب دیکھا۔ جوانی میں، فتح مکہ سے پہلے یا فتح کے بعد

یا یہ کہ کیا ان کا تعلق ان صحابہ سے ہے جو صغار اور کم سن تھے۔ محدثین نے صحابہ کو بارہ طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس علم کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ بعض مشائخ تابعی کو صحابی فرض کر لیتے ہیں، اور صحابی کو تابعی۔

۷۔ علم المراسیل: یعنی مراسیل کے بارے میں پوری پوری واقفیت رکھنا۔ مرسل حدیث وہ ہوتی ہے جس میں ایک تابعی صحابی کا نام لیے بغیر یہ کہے کہ آنحضرت نے یوں فرمایا۔ بشرطیکہ تابعی تک سلسلہ روایت اتصال سے اتصاف پذیر ہو۔ مراسیل حجت ہیں یا نہیں۔ اس میں دو رائیں ہیں۔ ایک گروہ ان کو حجت گردانتا ہے اور ایک گروہ حجت نہیں قرار دیتا۔

اہلِ مدینہ سے سعید بن المسیب، اہلِ مکہ سے عطا بن ابی رباح، اہلِ مصر سے سعید بن ابی ہلال، اہلِ شام سے مکحول الدمشقی۔ اہل بصرہ سے الحسن بن الحسن اور اہلِ کوفہ سے ابراہیم بن یزید النخعی مراسیل کے باب میں مشہور ہیں۔ لیکن ان میں سعید بن المسیب کے مراسیل کو صحت و صواب کے زیادہ قرین سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا شمار فقہائے حجاز میں ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے فقہ و ادراک میں تقدم حاصل کیا۔ تبع تابعین کے ارسال کو حجت قرار دیا جائے گا یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ فقہائے کوفہ میں بعض نے اس کو حجت ٹھہرایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اس نوع کے مرسل کو معضل کہنا چاہیے۔ مرسل نہیں

۸۔ حدیث منقطع کا علم: حدیث منقطع اس روایت کو کہتے ہیں جس میں ایک راوی کے چھوٹ جانے سے سلسلۂ اسناد میں انقطاع واقع ہو جائے۔ یہ حدیث مرسل سے مختلف ہے لیکن بہت کم حفاظ نے ان دونوں میں فرق و امتیاز کے حدود کو قائم رکھا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کی مثال ملاحظہ ہو:

حدثنا ابو عمرو عثمان بن احمد السماک ببغداد ــــــ حدثنا ابو ایوب بن سلیمان اسعدی، حدثنا عبد العزیز بن موسیٰ اللاجونی ابو روح،

حدثنا ھلال بن حق عن الجریری عن ابی العلاء وھو ابن الشخیر عن رجلین من بنی حنظلۃ عن شداد بن اوس — قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یعلم احدنا ان یقول فی صلوٰۃ اللّٰھم انی اسئلک الثبات فی الامور وعزیمۃ الرشد واسئلک قلبًا سلیمًا، ولسانًا صادقًا واسئلک شکر نعمتک وحسن عبادتک واستغفرک لما تعلم واعوذبک عن شر ما تعلم واسئلک من خیر ما تعلم۔

ہم سے حدیث بیان کی ابوعمرو عثمان بن احمد السماک نے بغداد میں، ان کا کہنا ہے ہم سے حدیث بیان کی ابوایوب بن سلیمان اسعدی نے، ان کا کہنا ہے ہم سے حدیث بیان کی عبدالعزیز بن موسیٰ اللاجونی ابوروح نے، ان کا کہنا ہے ہم سے حدیث بیان کی ہلال بن حق نے، انھوں نے الجریری نے ابوالعلا سے، اور یہ ابن الشخیر ہیں۔ انھوں نے بنی حنظلہ کے دو شخصوں سے اور انھوں نے شداد بن اوس سے۔ انھوں نے کہا، آنحضرتؐ ہمیں نماز میں پڑھنے کے لیے یہ دعا سکھایا کرتے تھے۔ اے اللہ! میں تجھ سے تمام امور میں ثبات قدمی کا طالب ہوں، اور رشد وہدایت میں عزیمت کا خواہاں ہوں اور قلبِ سلیم اور لسانِ صدق کا سائل ہوں اور تیرے انعامات پر شکر ادا کرنے کی توفیق چاہتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ تو میری عبادت کو سنوار دے اور ان تمام لغزشوں پر بخشش کا امیدوار ہوں جنھیں تو جانتا ہے۔ نیز خیر وشر کے بارے میں جیسے تو جانتا ہے تیری پناہ کا طالب ہوں۔

اس میں انقطاع اس لیے واقع ہوا کہ ابوالعلا ابن الشخیر اور شداد بن اوس کے درمیان دو شخصوں کا ذکر ہے، جن کے بارے میں یہ تصریح نہیں کی گئی کہ یہ کون ہیں۔

۔ انقطاع کی دوسری شکل یہ ہے کہ سلسلۂ اسناد میں کسی ایک راوی کا نام نہ لیا جائے، لیکن دوسری روایات سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ یہ شخص کون ہے۔ اس صورت میں یہ انقطاع زائل ہو جاتا ہے۔

جیسے مثلاً اس روایت میں ہے:

اخبرنا ابو العباس محمد بن احمد بن محبوب التاجر بمرو حدثنا احمد بن یسار، حدثنا محمد بن کثیر انبانا سفیان الثوری، حدثنا داؤد بن ابی ھند، حدثنا شیخ عن ابی ھریرۃ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یاتی علی الناس زمان یخیر الرجل بین العجز والفجور فمن ادرک ذٰلک الزمان فلیختر العجز علی الفجور۔

ہمیں ابو العباس محمد بن احمد بن محبوب التاجر نے بتایا، ان کا کہنا ہے ہم سے احمد بن یسار نے بیان کیا۔ ان سے محمد بن کثیر نے حدیث بیان کی۔ ان کو سفیان الثوری نے بتایا۔ ان کا کہنا ہے۔ ہم سے داؤد بن ابی ہند نے حدیث بیان کی، اور ان سے ایک شیخ نے ابی ہریرہ کے واسطہ سے روایت کی۔ ان کا کہنا ہے۔ آنحضرت ؐ نے فرمایا۔ لوگ ایک ایسے دور سے دوچار ہوں گے۔ جس میں ایک شخص کو عجز اور فجور کے بارے میں اختیار دیا جائے گا۔ سو جو شخص اس دور سے گزرے اُسے چاہیے کہ عجز کو فجور پر ترجیح دے یعنی عجز کو اختیار کرے اور فجور کا مرتکب نہ بنے۔

اس کی تائید ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے اور یہ شیخ جس کا نام نہیں لیا گیا ابو عمر الجدلی ہے۔ اس نوع کے انقطاع پر محدثین میں سے وہی گروہ آگاہ ہو سکتا ہے، جو اس فن میں تبحر و مہارت رکھتا ہو۔ کیونکہ جب تک احادیث پر عبور نہ ہو، یہ معلوم کرنا آسان نہیں ہوتا کہ انقطاع کی یہ صورت کن روایات کے بل پر دور ہوئی ہے۔

انقطاع کی تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی راوی جب اپنے شیخ سے روایت کرے تو اس سے اس کا سماع ثابت نہ ہو۔

جیسے اس حدیث میں ہے:

حدثنا ابو النصر محمد بن یوسف الفقیہ۔ حدثنا محمد بن سلیمان الحضرمی حدثنا محمد بن سھل، حدثنا عبد الرزاق، قال ذکر الثوری عن ابی اسحٰق عن زید بن یثیع عن حذیفہ، قال قال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان ولیتموھا ابابکر فقوی امین لا تاخذہ فی اللہ لومۃ لائم۔ وان ولیتموھا علیا فھاد مھدی یقیمکم علی طریق مستقیم۔

ہم سے حدیث بیان کی ابوالنصر محمد بن النصر محمد بن یوسف الفقیہ نے، ان کا کہنا ہے ہم سے حدیث بیان کی محمد بن سلیمان الحضرمی نے، ان کا کہنا ہے۔ ہم سے حدیث بیان کی محمد بن سہل نے، ان کا کہنا ہے۔ ہم سے حدیث بیان کی عبدالرزاق نے۔ ان کا کہنا ہے ثوری نے ابواسحٰق سے روایت کی۔ انھوں نے زید بن یثیع سے روایت کی۔ اور انھوں نے حذیفہ سے۔ ان کا کہنا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر تم خلافت کا بار ابوبکر کے کندھوں پر ڈالو تو یہ قوی اور امین ثابت ہوں گے۔ یہ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے اور اگر تم اس کا اہل علی کو قرار دو، تو وہ ہادی بھی ہیں اور مھدی بھی۔ یہ تمھیں صراط مستقیم پر چلائیں گے۔

اس روایت کا سلسلۂ اسناد اتصال لیے ہوئے ہے۔ الحضرمی اور محمد بن سہل ثقہ ہیں۔ یہاں انقطاع دو مقام پر واقع ہوا ہے۔ ایک تو عبدالرزاق نے ثوری سے نہیں سنا۔ دوسرے ثوری کا ابواسحاق سے سماع ثابت نہیں۔

۹۔ مسلسل کا علم: حاکم نے اس کی تعریف بیان نہیں کی، بلکہ اس کی آٹھ مثالوں کی وضاحت کی ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ ہے تسلسل۔ ابن الصلاح نے البتہ اس کی تعریف سے تعرض کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ عبارت ہے، رواۃ کے تسلسل اور توادر سے۔ یکے بعد دیگرے، کسی ایک صفت، لفظ یا حالت کے بارے میں۔ مثلاً سب کے سب، حدثنا یا اخبرنا کہیں۔ یا سب کے سب سمعت فلاناً کا انداز اختیار کریں۔ یا کوئی اور کیفیت بیان کریں۔ متن حدیث سے قطع نظر یہ لازم نہیں کہ یہ کیفیت یا حالت جو رواۃ تسلسل کے ساتھ بیان کریں بہرحال صحیح ہو، یعنی یہ ممکن ہے نفسِ حدیث صحیح ہو اگرچہ اس حالت یا کیفیت کا صحیح ہونا ضروری نہ ہو۔

۱۰۔ حدیثِ معنعن کو جاننا بھی علوم حدیث میں شمار ہوتا ہے۔ یہ حدیث

کی اس قسم کو کہتے ہیں جس میں کوئی راوی اپنے شیخ سے اخبرنا اور حدثنا کے بجائے عن فلان کہے۔ یعنی یہ روایت فلاں شخص سے مروی ہے۔ باالفاق اہلِ نقل اس نوع کی روایت کو متصل ہی قرار دیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ رواۃ میں کوئی ایسا راوی نہ ہو جو تدلیس کا عادی ہو۔

۱۱- **حدیث معضل کا جاننا** - معضل بفتح الضاد صحیح ہے، لغۃً اس کے معنی ایسے امر کے ہوتے ہیں جو شدید اور اشکال ہو۔ امام الحدیث علی بن عبداللہ المدینی کا کہنا ہے کہ معضل ایسی روایت سے تعبیر ہے جس میں ایک سے زیادہ راوی چھوٹ جائیں۔ یہ مرسل کے مختلف شی ہے، کیونکہ ارسال کا تعلق تابعین کے ساتھ مخصوص ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک طریق کے لحاظ سے روایت معضل ہو اور دوسرے طریق کے لحاظ سے متصل۔

ابن الصلاح کے نزدیک معضل سے مراد ایسی روایت ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں سے دو یا دو سے زیادہ راوی چھوٹ جائیں۔ یہ منقطع روایت کی ایک قسم ہے منقطع اور اس میں یہ فرق ہے کہ ہر معضل روایت منقطع ہے، لیکن ہر منقطع معضل نہیں ہوتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تبع تابعین یا اتباع تبع تابعین میں سے کوئی یہ کہہ دے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا یا ابو بکرؓ اور عمرؓ نے کہا۔

ابو بکر نصر السنجری کا کہنا ہے کہ وسائط کا ذکر کیے بغیر اگر کوئی راوی امام مالک کی طرح یہ کہہ دیتا ہے بلغنی عن ابی ھریرۃ تو اس کا شمار بھی معضلات میں ہوگا۔

حاکم نے اس حدیث کو بھی معضل ٹھہرایا ہے جسے تبع تابعین میں کوئی راوی موقوفاً روایت کرتا ہے، حالانکہ وہ حدیث متصل اور مسند ہے۔

حافظ عراقی نے معضل کی تعریف میں کہا ہے کہ وہ ایسی روایت ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں دو راوی ساقط ہوں، چاہے صحابی اور تابعی ساقط ہوں، چاہے تابعی اور تبع تابعین میں سے کوئی ساقط ہو، بشرطیکہ سقوط ایک مقام پر ہو۔ اگر

ایک راوی ایک جگہ چھوٹ گیا ہے، اور دوسرا راوی دوسری جگہ مذکور نہیں ہوا، تو اُسے منقطع کہیں گے، معضل نہیں۔

حافظ ابن عبد البر نے ایک کتاب اس موضوع پہ رقم فرمائی ہے جس میں موطا کے مرسلات، مقطعات اور معضلات کو موصولاً بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس نوع کی سب روایات دراصل مرفوع اور مسند ہیں۔

بعض محدثین کے کلام میں معضل کا اطلاق ایسی روایت پر بھی ہوا ہے، جس کے سلسلۂ اسناد میں سے اگرچہ کوئی راوی ساقط نہیں ہوا۔ تاہم اس کے معنی میں اغلاق پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس موقع پر معضل کا لفظ اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں ہوا، بلکہ لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی اس روایت کے فہم و ادراک میں شدید اشکال پایا جاتا ہے۔

۱۲- علم المدارج: اس سے مراد یہ جاننا اور معلوم کرنا ہے کہ حدیث کے اپنے الفاظ کیا ہیں اور وہ کون سا حصہ اس میں ایسا ہے جو صحابہ کے قول سے تعلق رکھتا ہے یا کسی دوسرے راوی سے، جو اس تلخیص یا تشریح و توضیح کی غرض سے درج ہو گیا ہے۔ اس کی مثال یہ حدیث ہے:

حدثنا ابوبکر بن اسحٰق الفقیہ انبأنا عمر بن جعفر السدوسی حدثنا عاصم بن علی حدثنا زہیر بن معاویہ عن الحسن بن الحر عن القاسم بن مخیمرۃ قال اخذ علقمۃ بیدی وحدثنی ان عبد اللہ، اخذ بیدہ وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخذ بید عبد اللہ، وعلمہ التشہد فی الصلاۃ وقال قل التحیات للہ والصلوٰت فذکر التشہد قال اذا قلت ھذا فقد قضیت صلاتک ان شئت ان تقوم فقم وان شئت ان تقعد فاقعد۔

ہم سے حدیث بیان کی ابوبکر بن اسحاق الفقیہ نے، ان کا کہنا ہے ہمیں بتایا عمر بن جعفر السدوسی نے، ان کا کہنا ہے ہم سے حدیث بیان کی عاصم بن علی نے، ان سے

حدیث بیان کی زہیر بن معاویہ نے، انھوں نے روایت کی الحسن بن الحر سے، اور انھوں نے روایت کی القاسم بن مخیمرہ سے - ان کا کہنا ہے - اثنائے روایت میں علقمہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ عبداللہ نے جب حدیث بیان کی تو انھوں نے بھی میرا ہاتھ پکڑا، اسی طرح آنحضرتؐ نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑا اور تشہد سکھایا - کہا، جب تم التحیات پڑھ چکو تو تم فارغ ہو، تمھاری نماز ہو چکی، اب چاہو تو کھڑے ہو جاؤ اور چاہو تو بیٹھے رہو۔

اس میں تشہد سکھانے کا ذکر ہے وہ تو معنی حدیث سے متعلق ہے اور جہاں اس کا ذکر ہے کہ جب تم التحیات پڑھ چکو تو فارغ ہو، تو یہ عبداللہ بن مسعود کا قول ہے۔ اس کی تائید شبانہ بن سوار کی روایت سے ہوتی ہے۔ اس نے اس بات کی روایت سے ہوتی ہے۔ اس نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ زیادت عبداللہ بن مسعود کی جانب سے ہے۔ دار قطنی نے شبانہ کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ یہ لائق اعتماد ہے۔

ادراج کی تین قسمیں ہیں۔ کبھی یہ حدیث کے اول میں واقع ہوتا ہے، کبھی درمیان میں اور کبھی آخر میں۔

ابن سمعانی کا کہنا ہے کہ قصداً ادراج جائز نہیں۔ الّا یہ کہ تلخیص یا تشریح کے نقطۂ نظر سے ہو۔ یعنی اگر کوئی جان بوجھ کر ادراج کا مرتکب ہوگا تو وہ ساقط العدالت قرار پائے گا۔

۱۳۔ تابعین کے بارے میں علم و آگاہی: علم و ادراک کی یہ نوعیت اس لیے اہمیت لیے ہوئے ہے کہ جو شخص تابعین اور ان کے طبقات سے آگاہ نہیں ہے، اس سے اس سہو و تساہل کا امکان ہے کہ تابعی کو صحابی قرار دے دے، یا صحابی کو تابعی سمجھ لے۔ یا یہ کہ تابعین اور تبع تابعین میں جو فرق و امتیاز کے حدود ہیں ان کو قائم نہ رکھ سکے۔

قرآن حکیم میں ہے:

والسّٰبقون السابقون الاولون من المھٰجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ واعد لھم جنّٰتٍ تجری تحتھا الانھٰر خٰلدین فیھا ابدًا ذٰلک الفوز العظیم ○ (توبہ ۱۰۰)

اور جو لوگ سب سے پہلے ایمان لائے مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی۔ اور جنھوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی، خدا ان سے خوش ہے اور وہ خدا سے خوش ہیں اور اس نے ان کے لیے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

حدیث میں ہے:

خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔

سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جنھوں نے میرا زمانہ پایا۔ اس کے بعد ان کا درجہ ہے، جو اُن سے ملے ہوئے ہیں اور اس کے بعد اس قرن کے لوگ بہتر ہیں جو اُن سے ملے ہوئے ہیں۔

اس حدیث سے صحابہ اور تابعین کی فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تابعین میں طبقۂ اولیٰ میں ان لوگوں کا شمار ہوتا ہے جنھوں نے صحابہ میں سے عشرہ مبشرہ کو دیکھا اور ان سے استفادہ کیا۔ جیسے سعید بن المسیب قیس ابن ابی حازم، ابوعثما النہدی، قیس بن عباد، ابوساسان حصین بن المنذر، ابو وائل بن سلمہ اور ابو رجاء العطاردی۔

طبقۂ ثانیہ ان لوگوں پر مشتمل ہے:

الاسود بن یزید، علقمہ بن قیس، مسروق بن الاجدع، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور خارجہ ابن زید۔

طبقۂ ثالثہ کا اطلاق جن لوگوں پر ہوتا ہے ان کے نام یہ ہیں:

عامر بن شراجیل الشعبی، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ اور شریح بن الحارث۔

تابعین ہی کے زمرہ میں ان لوگوں کو بھی شامل سمجھا جاتا ہے، جنھوں نے جاہلیت سے تائب ہو کر اسلام قبول کیا۔ آنحضرتؐ کا زمانہ بھی پایا۔ لیکن شرف صحبت سے محروم رہے۔ جیسے ابو رجا العطاردی، ابو وائل الاسدی، سوید بن غفلہ اور ابو عثمان النہدی۔

تابعین کتنے طبقات میں انقسام پذیر ہیں۔ اس میں اختلاف رائے ہے۔ مسلم نے کتاب الطبقات میں ان کی تعداد تین بتائی ہے۔ ابن سعد نے چار کی نشان دہی کی ہے اور حاکم نے پندرہ کی۔

۱۴۔ اتباع تابعین سے متعلق جاننا: تابعین کے بعد تبع تابعین کا درجہ ہے۔ صحابہ کے بعد اس طبقہ کو طبقہ ثالثہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بعض اوقات ناواقفی کی وجہ سے تبع تابعین کو ان کی علمی جلالت قدر شہرت کی بنا پر تابعی خیال کر لیتے ہیں اور ان کے مرویات کو مرسلات کے زمرے میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ اس غلط فہمی اور اشتباہ سے دامن کشاں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں اور تابعین میں فرق و امتیاز کے حدود کو ملحوظ رکھا جائے۔

تبع تابعین ہیں، الحسین بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کا نام نامی بھی ہے۔ ان کو الحسین الاصغر کہا جاتا ہے۔ عبد اللہ بن مبارک نے ان سے روایت کی ہے۔ ان کے علاوہ سلیمان الاحول اور سلیمان بن عبد الرحمن الدمشقی وغیرہم اس طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔

۱۵۔ اکابر کا اصاغر سے روایت کرنا: علم کی یہ نوعیت بہت اہم ہے۔ محدثین علیہ الرحمۃ بسا اوقات ان لوگوں سے بھی اخذ روایت کرتے ہیں جو مرتبہ میں ان سے کم درجہ کے حامل ہوں۔ اس لیے کہ محدث کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ بلا امتیاز ہر شخص سے اخذ روایت کرے جس کے پاس یہ روایت موجود ہو۔ چاہے وہ اس سے اونچے درجے کا ہو، چاہے مساوی درجے کا ہو۔

اور چاہے کم درجے کا - اس سے یہ شبہ ابھرتا ہے کہ شاید مروی عنہ کا مقام راوی سے اونچا ہے حالانکہ واقعہ میں ایسا نہیں ہوتا - مثلاً، لیث اگر عبداللہ بن صالح سے روایت کریں، یا ابن جریج ابن العلیہ سے روایت کریں تو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ عبداللہ بن صالح، یا ابن العلیہ، لیث اور ابن الجریج سے رتبہ میں فائق ہیں -

۱۶ - اولاد و صحابہ کے بارے میں علم : سب سے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آنحضرتؐ کی اولاد میں کون کون لوگ شامل ہیں اور کن سے روایت کرنا چاہیے کیونکہ جہاں تک مرویاتِ اہلِ بیت کا تعلق ہے اس میں کوئی دو سو کے قریب مرد اور عورتیں شامل ہیں - اس کے بعد صحابہ، تابعین اور اتباعِ تابعین کی اولادیں آتی ہیں - ان سب کے بارے میں متعلمِ حدیث کے لیے جاننا ضروری ہے تاکہ روایت کی صحت و تثبیت سے متعلق وثوق سے کوئی بات کہی جا سکے -

۱۷ - اصح الاسانید کون کون ہیں : محدث کے لیے عدالت شرط ہے - عدالت کے معنی یہ ہیں کہ محدث مسلمان ہو، بدعات کا حامی نہ ہو - اس کے ساتھ ساتھ اگر یہ حافظِ حدیث بھی ہے تو اس سے اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے - محدثین صحابہ سے چونکہ مختلف طرق سے مرویات نقل کرتے ہیں، اس لیے یہ فیصلہ کرنا ازدیادِ علم کا باعث ہے کہ اسناد میں اجود، اور صحیح تر سند کون ہے -

ائمہ حدیث کے حلقوں میں اس امر میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے - امام بخاری کی یہ رائے ہے کہ اصح الاسانید کا اطلاق ان روایات پر ہوتا ہے، جن میں مالک بن نافع سے اور نافع ابنِ عمر سے روایت کریں - ابوبکر بن ابی دارم نے اپنے بعض شیوخ کی وساطت سے ابوبکر بن ابی شیبہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اصح الاسانید میں روایت کے وہ تمام طرق شامل ہیں جن میں زہری، علی بن الحسین سے روایت کریں اور ان کے باپ حضرت علی سے روایت کریں -

احمد بن حنبل، یحییٰ بن معینؒ اور علی المدینی نہ صرف اونچے درجے کے محدث ہیں بلکہ ان کا شمار بلند پایہ نقادانِ فن میں بھی ہوتا ہے - ان میں ایک مرتبہ اس

سوال پر مذاکرہ ہوا کہ اجود الاسانید کون ہیں۔

احمد بن حنبل کا کہنا تھا کہ وہ تمام اسناد اجود و اصح ہیں جنھیں زہری سالم سے اور سالم اپنے باپ سے روایت کریں اور علی المدینی کی رائے تھی کہ اجود الاسانید کا اطلاق ان مرویات پر ہوتا ہے، جن میں ابنِ عون، محمد سے روایت کریں، اور محمد عبیدہ سے روایت کریں اور عبیدہ حضرت علی سے۔

اہلِ بیت کے مرویات میں سے ان روایات کو اصح قرار دیا گیا ہے جو جعفر صادق سے بواسطہ محمد مروی ہوں، بشرطیکہ محمد اپنے باپ سے اور ان کے باپ اپنے دادا سے اور ان کے دادا حضرت علی سے روایت کریں۔

چونکہ حضرت صادق کی بہت سی غلط روایات منسوب بھی کر دی گئی ہیں، اس لیے اس سلسلے میں یہ احتیاط ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ ان سے روایت کرنے والا ثقہ ہو، اور اس کا دامنِ فکر و عمل، غلو اور بدعات کے ارتکاب سے داغ دار نہ ہو۔

۱۸- ناسخ و منسوخ کا علم: اس سے مقصود اس امر کا جاننا ہے کہ کس خاص مسئلہ میں آنحضرتؐ نے آخر آخر کیا روش اختیار کی ہے اور کس سابقہ قول و عمل کو منسوخ ٹھہرایا ہے۔ ابوایوب انصاری سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

توضؤا مما غیرت النار۔

ان چیزوں کے کھانے کے بعد وضو کرو، جن میں آگ نے تغیر پیدا کیا ہے۔ یعنی جو چیزیں آگ پر پکائی یا تپائی گئی ہیں، ان کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ قول ابتدا میں معمول بہ تھا۔ جابر سے روایت ہے:

کان اٰخر الامرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ترک الوضوء مما مست النار۔

اس باب میں آپ کا آخری معمول یہ تھا کہ آپ اس طرح کی چیزوں کے استعمال سے وضو کا اعادہ نہیں کرتے تھے۔ ناسخ و منسوخ کا مسئلہ ائمۂ حدیث

کے حلقوں میں جانا بوجھا مسئلہ ہے اور اس کی کئی مثالیں کتبِ حدیث میں پائی جاتی ہیں۔

۱۹- الفاظ غریبہ کا علم: متونِ حدیث میں بعض ایسے الفاظ بھی آتے ہیں، جو لغۃً غریب یا غیر مانوس ہیں، ان کی نشان دہی کرنا بھی فنِ حدیث کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ تبع تابعین میں سے مالک، ثوری اور شعبہ نے اس فن پر خصوصیت سے گفتگو کی ہے۔ اول اول جن لوگوں نے اس موضوع پر کھل کر اظہار خیال کیا، ان میں نضر بن شمیل اور ابو عبید القاسم بن سلام کا نام سرِفہرست ہے۔ بعض کی رائے میں اس فن سے متعلق پہلے پہل ابو عبیدہ معمر بن المثنی نے ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد اسی موضوع پر عبدالملک بن قریب الاصمعی نے اظہار خیال اور دوسری صدی کے بعد اسی فن پر مطرب کی ایک تصنیف کا بھی پتا چلتا ہے۔

۲۰- احادیث میں افراد کا علم: اس کا مطلب یہ ہے کہ روایات میں اس بات کا جاننا کہ کہاں کہاں ان میں تفرد اور اختصاص واقع ہوا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

۱- کسی ایک سنت کے بارے میں کسی صحابی سے ایک ہی شہر کے رواۃ روایت کریں۔ جیسے کوفہ، بصرہ، مدینہ، شام، مکہ اور خراسان۔

۲- ایسی روایات ہیں جو کسی ایک راوی سے مروی ہوں۔

۳- ایسی روایات جن میں اہلِ مدینہ مثلاً اہلِ مکہ سے منفرد ہوں، یا اہلِ خراسان اہلِ حرمین سے مختلف روش اختیار کریں۔

۲۱- مدلسین سے متعلق جاننا: یعنی ان روایات کے بارے میں علم و معرفت حاصل کرنا، جن میں رواۃ نے تدلیس سے کام لیا ہو اور یہ نہ معلوم ہو کہ انھوں نے جو روایات لکھی ہیں ان میں باقاعدہ سماع ثابت ہے یا نہیں۔ تابعین نے جو تبع تابعین وغیرہم کی ایک جماعت نے تدلیس اختیار کی ہے۔ امیر عبداللہ نے اس کو چھ خانوں میں تقسیم کیا ہے:

۱- مدلسین کا وہ گروہ جس نے ثقات کے بارے میں تدلیس کی۔

۲- ایسی روایات جن میں اس بات کا ذکر تو ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے کہا لیکن ان میں سماع کی وضاحت نہیں ہوتی۔ اِلّا یہ کہ بہ اصرار ان سے دریافت کیا جائے اور مراجعہ و مذاکرہ سے کام لیا جائے، اس صورت میں یہ بتا دیں کہ انھیں سماع حاصل ہے۔

۳- ایسے اشخاص کے بارے میں تدلیس اختیار کی جائے، جو مجہول ہیں۔ یعنی نہ تو یہ معلوم ہو کہ یہ کون ہیں۔ اور نہ یہ معلوم کہ ان کا تعلق کس جگہ سے ہے۔ مجہولین سے بہت سے حضرات نے روایت کی ہے، جن میں سفیان الثوری، شعبہ ابن الحجاج اور بقیہ بن الولید جیسے ائمہ حدیث شامل ہیں۔ بقیہ کے بارے میں خصوصیت سے امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ اگر یہ مشہورین سے روایت کریں تو ان کی روایت مقبول ہوگی، ورنہ نہیں۔

۴- ایک گروہ ایسا ہے، جس نے ایسے اشخاص سے روایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا، جن پر محدثین نے جرح کی ہے۔ انھوں نے روایات میں تدلیس سے بھی کام لیا ہے اور جن سے روایت کی ہے ان کے ناموں اور کنیتوں کو بھی بدل دیا ہے تاکہ انھیں پہچانا نہ جا سکے۔

۵- تدلیس کی ایک شکل یہ ہے کہ بعض رواۃ نے بعض شیوخ سے بہت کچھ سنا لیکن کچھ چیزیں ذہن کی گرفت سے نکل گئیں۔ لہٰذا انھیں تلافیِ مافات کے لیے تدلیس کی آڑ لینا پڑی۔ اس صورت میں حذاقِ فن کا یہ کام ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ روایت کا کون حصہ سماع سے بہرہ مند ہے اور کون حصہ سماع سے محروم ہے۔

۶- بعض رواۃ نے ایسے شیوخ سے روایت کی، جن کو نہ تو انھوں نے دیکھا اور نہ سنا، لیکن اس کے باوجود اس کے اقوال کو سماع پر محمول کیا گیا، حالانکہ ان شیوخ سے ان کا سماع بالکل ثابت نہیں۔

اس تقسیم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تدلیس کے کئی درجات و مراتب ہیں اور ہر درجے کا حکم متعین و مختلف ہے، اور اس بات کا فیصلہ کرنا کہ تدلیس کن کن صورتوں

میں گوارا ہے اور کن کن صورتوں میں گوارا نہیں۔ محدثین میں سے ماہرینِ فن کا کام ہے۔
بلادِ اسلامی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اہلِ حجاز اور اہلِ مصر تدلیس کے مطلق قائل نہیں۔ اسی طرح اہلِ خراسان اور اہلِ جبال یا اصبہان اور بلادِ فارس و خوزستان کے محدثین میں مدلس پائے نہیں جاتے۔ ہاں اہلِ کوفہ میں تدلیس البتہ عام ہے۔ اہلِ بصرہ میں سے کچھ لوگوں نے تدلیس اختیار کی ہے۔ بغداد کا دامن بھی جو عروس البلاد ہے اور جس نے جلیل القدر محدثین پیدا کیے، تدلیس کے داغ سے پاک ہے۔ اس میں طبقہ سابعہ کا صرف ایک شخص الباغندی ہے جو تدلیس سے متہم ہے۔ علومِ حدیث کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں مذکور مباحث کے علاوہ اور مباحث بھی ہیں، جن سے محدثین نے تعرض کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ روایات میں شذوذ کے کیا معنی ہیں۔ سنن کے بارے میں اگر دو متعارض روایات ہوں جو صحت و سقم میں برابر ہوں تو اصحاب مذاہب کیونکر ایک کو راجح اور دوسری کو مرجوح قرار دیتے ہیں۔ ایسی کونسی روایات ہیں، جو تعارض سے مبرّا ہیں۔ اگر کوئی راوی کسی روایت میں فقہی الفاظ کا اضافہ کرتا ہے تو اس کا علم کیونکر ہوتا ہے، اخذِ علم سے متعلق محدثین کن اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ مذاکرہ حدیث کی کیا اہمیت ہے۔ اسناد میں کہاں کہاں تصحیفات رونما ہیں۔ رواۃ میں وہ کون لوگ شامل ہیں جو رشتۂ اخوت میں منسلک ہیں۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین وہ کون حضرات ہیں، جن سے صرف ایک ہی شخص نے روایت کی ہے۔ صحابۂ تابعین اور تبع تابعین سے روایت کرنے والوں کا تعلق کن قبائل و شعوب سے تھا۔ یا یہ کہ محدثین کے اسما اور کنیتیں کیا کیا ہیں۔ روایات میں موالی اور ان کی اولادوں کا کیا حصہ ہے۔ رواۃ حدیث کی عمروں کی کیا کیفیت ہے۔ تابعین اور تبع تابعین میں سے کون کون ہم عصر ہیں۔ آنحضرتؐ کے مغازی و سرایا کی تعداد کتنی ہے؟ وغیرہ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

وہ جلیل القدر صحابی جس نے اپنے وطن عزیز اور اقربا کو خیرباد کہا اور مدینۃ الرسول میں آ بسا، جو صبح و شام اور سفر و حضر میں آنحضرت کے ساتھ رہا۔ جس نے اسلام کے ہمہ گیر اصولوں کو اپنی آنکھوں سے عمل و کردار کے سانچوں میں ڈھلتے ہوئے دیکھا۔ اور ورثۂ نبوت اور علوم رسالت سے نہ صرف اپنے دامن طلب و جستجو کو سنوارا اور آراستہ کیا، بلکہ ان کی اشاعت و فروغ کے لیے عمر بھر کوشاں بھی رہا۔ تعجب ہے کہ بعض لوگوں نے اسلام کی اس عظیم شخصیت کو بھی ہدفِ مطاعن اور موردِ الزام ٹھہرایا۔ سب سے پہلے نظام نے زبانِ طعن درازکی۔ اس کے بعد اسی کی صدائے بازگشت گولڈ تسیہر نام نہاد تحقیقاتِ علمی میں سنائی دی اور پھر الزام تراشی کا یہ سلسلہ چل نکلا، اور احمد امین، ابوریہ اور ان استشراک زدہ حضرات پر جاکر اختتام کو پہنچا، جنھوں نے اسلام کو صرف مغرب کے نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی، حالانکہ اسلام بجائے خود ایک دین اور ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ یہی نہیں اسلام ایک جامع تہذیب اور علم و عرفان کا شاندار سرچشمہ ہے جس کے فیوض و برکات سے پوری نوع انسانی بہرہ مند ہوئی ہے اور کتاب و سنت اس کا ماخذ و مصدر صحیح ہے۔ مزید برآں اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اپنے علوم ہیں اور نقد و روایت کے اپنے پیمانے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یہ لوگ اسلام کو اسلام ہی کے آئینے میں دیکھتے اور اسلام کی مایہ ناز ہستیوں کے بارے میں اگر کچھ کہنا چاہتے تو ان اصولوں اور پیمانوں کو سامنے رکھ کر کہتے لیکن ایسا نہ ہوا، کیونکہ ان کی نظریں استشراق کی جھوٹی چمک دمک سے اس درجہ خیرہ ہو چکی تھیں کہ ان کے لیے اس کے سوا

اور کوئی چارہ کار ہی نہیں رہا تھا کہ یہ تحقیق کی محنت طلب راہ کو چھوڑ کر تقلید کی آسان راہ اختیار کریں، اور اسی طرح سوچیں جس طرح ان کے اساتذۂ مغرب نے سوچا۔ جہاں تک نظّام کا تعلق ہے۔ اس کی کمزوری یہ تھی کہ وہ کٹّر معتزلی تھا۔ اس لیے جب اس نے دیکھا کہ حضرت ابو ہریرہ کی مرویات میں اس کے عقائد و مزعومات کی تائید نہیں ہوتی جو یونانی فلسفہ پر مبنی تھے تو اس نے ضروری سمجھا کہ احادیث رسول پر وار کرے اور حضرت ابوہریرہ کو خصوصیت سے اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ بنائے۔ رہے گولڈزیہر تو اُن کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ پہلے یہودی ہیں، اور پھر مستشرق۔ ان کی اسلام دشمنی اظہر من الشمس ہے۔ انھوں نے ہرچند یہ کوشش کی ہے کہ ان کے تعصّبات پر علم و تحقیق کے خوشنما پردے پڑے رہیں۔ لیکن اہلِ علم سے بھلا ان کی ملمع کاریاں کیونکر پوشیدہ رہ سکتی تھیں۔ آخر ان کے تبحر اور علامگی کا بھرم کھل کر رہا۔

ان لوگوں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے، جو اپنے ہاں کے خزائن علمی اور مدوّنات و اصول کو چھوڑ کر اہلِ مغرب کے پیچھے ہو لیے۔ ان کو اس بنا پر معذور سمجھنا چاہیے کہ یہ در اصل کم مایہ لوگ ہیں، اور اپنی کم مائیگی اور مرعوبیت کی وجہ سے قطعاً اس لائق نہیں کہ اسلامی ماخذ و مصنفات کی درخشانیوں سے کسبِ ضو کر سکیں۔ یہ لوگ اپنے تہذیبی تشخص کو کھو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے، یہ اس مسلّم حقیقت کو نہیں جان پائے کہ حدیث و سنت کی تشریحات کو تسلیم کیے بغیر ثقافت و تمدن کا وہ حسین و جمیل نقشہ ترتیب ہی نہیں پا سکتا۔ جو اپنی جگہ ہر طرح متعین اور جامع ہے۔

ان لوگوں نے حضرت ابوہریرہؓ کی ذاتِ گرامی پر کیا کیا اعتراض کیے، اور کس کس انداز سے ان پر اتہام و الزام کے تیر برسائے۔ ان کی نشان دہی کرنے سے پہلے یہ مناسب ہو گا کہ ہم ان کی اصلی صورت ناظرین کے سامنے پیش کر دیں جس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ آنحضرتؐ صحابہ اور تابعین کی نظروں میں ان کا مقام و درجہ کیا تھا؟ اور در حقیقت یہ کن فضائل و مناقب سے اتصاف پذیر

تھے۔

نام اور کنیت: مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے ان کا کیا نام تھا۔ اس کے بارے میں اختلاف آرا ہے۔ الحلبی نے چوالیس کے قریب نام گنوائے ہیں۔ لیکن جس قول کو مرجح اور مشہور سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ جاہلیت میں عبد شمس بن صخر کے نام سے موسوم تھے۔ آنحضرت نے ان کا نام عبدالرحمن تجویز فرمایا۔ ان کا تعلق قبائل یمن کے ایک قبیلے دوس سے تھا اور ان کی والدہ کا نام امیمہ صفیح بن الحارث تھا۔

ابو ہریرہ ان کی کنیت تھی۔ ہریرہ کے معنی چھوٹی سی بلّی کے ہیں۔ ترمذی کی ایک روایت میں انھوں نے اس کنیت کی توجیہ یوں فرمائی ہے کہ میں بھیڑ بکریاں چرایا کرتا تھا۔ اس اثنا میں میں نے ایک بلّی پال رکھی تھی، جس کو رات کے وقت کسی درخت کے پاس چھپا دیتا اور دن کو اسے یہاں سے نکال لیتا اور پھر اس کے ساتھ دن بھر کھیلتا اور جی بہلاتا۔ اس پر لوگوں نے مجھے ابو ہریرہ یعنی بلّی کا باپ کہنا شروع کر دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ خود آنحضرتؐ نے مجھے اس حال میں دیکھ کر ابا ہر کی کنیت سے نوازا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کنیت ان کو اس درجہ بھائی اور صحابہ کے حلقوں میں اس درجہ مقبول ہوئی کہ زندگی بھر یہ اسی کنیت پر فخور و نازاں رہے۔

شکل و صورت: گندمی لیکن نکھرتا ہوا رنگ، چوڑا چکلا سینہ، سرخ داڑھی، اور اگلے دو دانتوں میں فاصلہ تھا۔ زلفیں رکھتے تھے۔ خباب بن عروہ کا کہنا ہے کہ میں نے انھیں سیاہ عمامہ زیب سر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

قبول اسلام: یہ اپنے وطن یمن میں الطفیل بن عمرو کے ذریعہ ۸ ھ میں اسلام لا چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے مدینۃ النبی کا رُخ کیا، اور اس وقت یہاں پہنچے، جب آنحضرت غزوہ خیبر سے لوٹ رہے تھے۔ راستہ میں شوق و ولولہ کا کیا عالم تھا۔ اس کا اندازہ اس سے شعر سے کیجیے جو اثنائے سفر میں یہ پڑھتے

جاتے تھے:

یا لیلۃ من طولھا وعنائھا   علی انھا من دار الکفر نجت

مدینہ میں آکر تعلیم کی غرض سے صفہ میں قیام کیا اور ہمیشہ کے لیے دامنِ نبوت سے وابستہ ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی۔

اخلاق و شمائل: آنحضرتؐ سے تعلق خاطر عشق کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔ تمام مہاجرین و انصار اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہے۔ لیکن ان کی خواہش و آرزو کا محور ہمیشہ حضور کا مشاہدۂ جمال رہتا۔

اور یہی بات بقول ان کے، ان کا سرمایۂ راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھی — آنحضرتؐ کے بعد پُر تکلف غذا سے محض اس بنا پر مجتنب رہتے تھے کہ آنحضرتؐ نے کبھی سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔ ایک دفعہ کچھ حضرات نے بھُنی ہوئی بکری کی دعوت دی، لیکن انھوں نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ یہ جانتے تھے کہ آنحضرت دنیا سے اس عالم میں رخصت ہوئے کہ کبھی جَو کی روٹی بھی بھر پیٹ نہیں کھائی۔

آنحضرتؐ کے ساتھ جو عشق و شیفتگی تھی، اس کو انھوں نے آلِ رسول کے ساتھ بھی برقرار رکھا۔ ایک مرتبہ حضرت حسن سے ملے تو کہا اپنے پیٹ کا وہ حصہ کھولیے جو آنحضرتؐ کا بوسہ گاہ تھا۔ آپ نے کپڑا ہٹایا تو ابوہریرہ نے اسی جگہ بوسۂ محبت ثبت کر دیا۔

آپ کا معمول تھا کہ دن میں روزہ رکھتے اور شب کو قیام فرماتے۔ بارہ ہزار تسبیحیں روزانہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اپنے گناہوں کے انداز سے تسبیح کرتا ہوں۔ تسبیح و تہلیل کا یہ سلسلہ شب و روز جاری رہتا۔ ایک تھیلی میں کنکریاں، اور گٹھلیاں بھری رہتیں، ان پر یہ تسبیح پڑھتے تھے، جب کنکریاں اور گٹھلیاں ختم ہو جاتیں تو لونڈی پھر بھر لاتی، اور پھر ذکر و فکر الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔

فقر و مسکنت پر انھیں ناز تھا۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں اس حال میں

حاضر باش رہتے کہ بھوک انھیں بے قرار رکھتی - امام التابعین ابن المسیب کا کہنا ہے کہ بیر کاروبار کے سلسلے میں اکثر بازار کا چکر لگاتے جب گھر لوٹتے تو پوچھتے کیا تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے، جب گھر کے لوگ انکار کرتے تو کہتے اچھا آج روزہ ہی سہی۔

حق گوئی و بے باکی ان کا شیوہ تھا، اور اس معاملہ میں ان کی جرأت وجسارت بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی - ان کا قیام مدینے میں تھا اور مروان یہاں کا والی تھا - ایک مرتبہ اس کے ہاں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اس نے اپنا کمرہ تصویروں سے سجا رکھا ہے - فرمایا! میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے جو میری مخلوق کی طرح مخلوق بناتا ہے (اگر دعوائے الوہیت ہے) تو کوئی ذرہ، اناج یا جو پیدا کر کے تو دکھائیے۔

ایک مرتبہ مسجد نبوی میں کچھ لوگوں کے ساتھ تشریف فرما تھے، مروان بھی اس مجلس میں موجود تھا - انھوں نے فرمایا، میں نے صادق مصدوق سے سنا ہے کہ میری امت کی تباہی قریش کے لونڈوں کے ہاتھوں ہوگی۔

اسلام میں دیانت و امانت سب سے بڑا وصف ہے، جسے ہر مسلمان کو اپنانا چاہیے - حضرت ابوہریرہ کا اس میں کیا مقام تھا، ان کی زندگی میں اس کی ایک جھلک دیکھیے - حضرت عمر نے انھیں بحرین میں عامل کی حیثیت سے متعین کیا - جب وہ وہاں سے فارغ ہوئے تو دس ہزار کی خطیر رقم ان کے پاس تھی - حضرت عمر کی نگاہِ احتساب ان پر پڑی - پوچھا کہ اتنی بڑی رقم کیسے جمع کر لی - ان کا کہنا تھا:

خیل نتجت و اعطیات تتابعت وخراج رقیق لی۔

کچھ تو گھوڑیوں نے بچے دیے، کچھ عطیے آئے، اور کچھ غلاموں کے خراج سے وصول ہوا۔

تحقیقات کی گئی تو یہ بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

حضرت عمر نے دوبارہ بحرین کی ولایت کی پیش کش کی، لیکن انھوں نے معذرت کی - اس پر حضرت عمر نے فرمایا، اس منصب کی حضرت یوسف علیہ السلام تک نے

آرزو کی، جو تم سے بہر حال افضل تھے۔ انھوں نے جواب میں کہا، وہ تو پیغمبر اور پیغمبر زادے تھے اور میں امیمہ کا بیٹا ہوں۔ نیز مجھے تین چیزوں کا خدشہ ہے:

ان اقول بغیر علم، او اقضی بغیر حق و ان یضرب ظھری ویشتم عرضی و ینزع مالی۔

ایک یہ کہ بغیر علم کے لب کشائی کروں، دوسرے یہ کہ بغیر حکم شرعی کے فیصلہ کروں، تیسرے یہ کہ مارا جاؤں، ہدفِ مطاعن بنوں اور میرا مال چھین لیا جائے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے پوچھا تم نے منصبِ امارت کو کیسا پایا۔ انھوں نے کہا:

بعثتنی و انا کارہ و نزعتنی وقد احببتھا۔

جب آپ نے مجھے اس منصب پر فائز کیا تھا، اس وقت میں اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا اور اب جب آپ نے یہ عہدہ مجھ سے چھین لیا، میں خوش ہوں۔

فتن سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے، البتہ جب باغیوں نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو اس وقت یہ ان کے گھر میں موجود تھے اور لوگوں کو ان کی امداد و اعانت پر آمادہ کرتے تھے۔

زہد و عبادت کی فراوانیوں اور امارت و ولایت کی فتنہ سامانیوں نے نہ تو ان میں کبر و غرور پیدا کیا تھا اور نہ انھیں عبوساً قمطریراً بنایا تھا۔ خود بھی خوش رہتے تھے اور لوگوں کو بھی وہ اپنے مزاح و فکاہات سے خوش رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ لکڑیوں کا گٹھا پیٹھ پر لادے ہوئے بازار سے گزر رہے تھے۔ اس اثنا میں ان کی نظر ثعلبہ بن ابی مالک پر پڑی۔ ان کو مخاطب کر کے کہا:

اوسع الطریق للامیر۔

راستہ چھوڑ دو، امیر (والی) آرہے ہیں۔

بچوں کا مجمع دیکھتے تو اس میں گھس جاتے اور ان کے کھیل کود میں شریک ہو جاتے۔

ابورافع سے منقول ہے، مجھے ایک مرتبہ انھوں نے رات کے کھانے پر بلایا۔ چنانچہ حسبِ وعدہ میں ان کے ہاں پہنچا اور کھانے میں مشغول ہوا تو کہنے لگے: دع العراق للامیر۔

بھائی سب کچھ کھالو مگر یہ ہڈی والی، کے لیے چھوڑ دو۔

گویا دعوت گوشت کی تھی اور اسے یہ گوشت سمجھ کر تناول کر رہے تھے۔ حالانکہ وہ صرف ثرید تھا، جس کو گھی سے تیار کیا گیا تھا۔

بہت فیاض اور مہمان نواز تھے۔ الطفاوی کا کہنا ہے مجھے ان کے ہاں چھ مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان سے زیادہ کسی کو مہمان نواز نہیں پایا۔

علمی زندگی میں ان کا مقام۔ حضرت ابوہریرہ چار سال تک آنحضرت کی رفاقت میں رہے اور اس دوران انھوں نے بہت کچھ سنا، اور بڑی حد تک سنت کے حقائق و رموز کو جانا بوجھا، اور یہ دیکھا کہ اسلام کے نظامِ حیات نے اپنی روح وقالب کے ساتھ کس طرح عمل و تشریع کی فعال شکل اختیار کی۔ آنحضرتؐ ان کی منزلت و درجہ سے واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ نے جب العلاء الحضرمی کو بحرین بھیجا تو ان کو ان کے ساتھ کر دیا۔ تاکہ یہ امامت و تدریس کے فرائض انجام دیں۔ طلب علم میں ان کے شوق وحرص کا کیا عالم تھا۔ اس کو اس حدیث کی روشنی میں دیکھیے۔

ایک مرتبہ انھوں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ:

من اسعد الناس بشفاعتك يوم القيمة۔

قیامت کے روز کون خوش قسمت آپ کی شفاعت کا زیادہ مستحق قرار پائے گا۔

آپ نے فرمایا، تمھاری جستجو اور حرص علی الحدیث کو دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سوال تم سے پہلے کوئی نہ کرے گا۔ علم ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ دعا بھی مانگتے تو فراوانی علم کی۔ زید بن ثابت کا کہنا ہے، ایک روز میں اور فلاں شخص مسجد میں بیٹھے دعا اور ذکرِ الٰہی میں مصروف تھے کہ اتنے میں آنحضرتؐ تشریف لے آئے۔

ہم سب چپ ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا سلسلہ کلام جاری رکھو۔ آپ کی اس اجازت کے پیش نظر میں اور میرا ساتھی دعا میں مشغول ہو گئے۔ آنحضرتؐ ہماری دعا پر آمین کہتے جاتے تھے۔ پھر ابو ہریرہ نے دعا کی:

اللھم انی اسئلک ما سئلک صاحبالی واسئلک علما لا ینسی فقال صلی اللہ علیہ وسلم۔ آمین۔

اے اللہ! میرے دو ساتھی تجھ سے جو طلب کر چکے ہیں وہ مجھے بھی عطا کر۔ اور مزید برآں ایسا علم عطا کر، جو فراموش نہ ہو سکے۔

اس پر بھی آنحضرتؐ نے آمین کہی۔ ہم سب نے کہا، یا رسول اللہؐ! ہم بھی ایسے علم کے متمنی ہیں جو نسیان کے عمل دخل سے مبرا ہو۔ آپ نے فرمایا وہ تو دوسی نوجوان کا مقدر بن چکا۔

حضرت ابو ہریرہ ہی سے یہ حدیث مروی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

لا تسئلنی من ھذہ الغنائم التی یسئلنی اصحابک؟

اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح کیا تم ان غنائم میں سے اپنے لیے کچھ طلب نہیں کرو گے۔

ان کا جواب کس درجہ اخلاص اور علمی لگن لیے ہوتے ہے:

اسئلک ان تعلمنی مما علمک اللہ۔

میری تو آپ سے یہی استدعا ہے کہ آپ مجھے وہ سب کچھ سکھا دیں جس کی اللہ نے آپ کو تعلیم دی ہے۔

صحابہ رسول بھی ان کے علمی مرتبے سے اچھی طرح روشناس تھے۔ مسجد نبوی میں ان کی باقاعدہ نشست ہوتی جس میں یہ ان کے سامنے احادیث بیان کرتے اور مختلف سائلین کے فتووں کا جواب مرحمت فرماتے۔

معاویہ بن ابی عباس الانصاری سے منقول ہے کہ یہ عبداللہ بن الزبیر

کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے کہ اس اثنا میں محمد بن ایاس بن بکیر آئے۔ انھوں نے اس شخص کے بارے میں فتویٰ طلب کیا جس نے اپنی بیوی کو وظیفہ جنسی ادا کرنے سے پہلے تین طلاقیں دے دیں۔ ابن الزبیر نے ان سے دریافت کیا۔ حضرت ابن عباس اس بات کو سن کر ابوہریرہ کی طرف ملتفت ہوئے اور کہا:

افتہ یا ابا ھریرۃ۔

ابو ہریرہ! تم اس کا جواب دو۔

محمد بن سیرین کا کہنا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کا معمول تھا کہ ہر جمعرات کو ایک مجلس علمی کا انعقاد کرتے اور اس میں احادیث رسول لوگوں تک پہنچاتے۔

مکحول سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے ان سے احادیث سننے کے لیے اشتیاق ظاہر کیا اور اجتماع کے لیے جگہ کا تعین بھی کر لیا۔ یہ حسب وعدہ وہاں پہنچے، اور رات بھر حدیثیں بیان کرتے رہے۔

حدیث کی روایت میں اس درجہ محتاط تھے کہ جب کسی مسئلہ میں اپنی رائے اور اجتہاد کی روشنی میں کچھ کہتے تو ان واشگاف الفاظ میں اس بات کا اظہار کر دینا بھی ضروری خیال کرتے

ھذا من کسبی۔

یہ میری اپنی رائے ہے۔

علم و معرفت کا ایک ظرف تھے۔ کہا کرتے تھے کہ میں نے آنحضرتؐ سے علم کے دو ظرف پائے ہیں، ایک ظرف کی احادیث بیان کی ہیں۔ دوسرے کی نہیں۔ کیونکہ اگر دوسرے ظرف کو پھیلا دوں تو نرخرہ کاٹ دیا جائے۔ صوفیا کا خیال ہے یہ احادیث توحید کے اسرار و رموز پر مشتمل تھیں۔ متکلمین ان کو اسرارِ دین سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن محدثین کرام کا یہ فیصلہ ہے کہ ان کا تعلق سراسر فتن اور پیش گوئیوں سے تھا۔

حضرت ابوہریرۃ نہ صرف احادیث و سنن کے بہت بڑے حافظ تھے بلکہ

اتقان وضبط میں بھی ان کا پایہ بلند تھا۔ ان کا قول ہے کہ میں آنحضرتؐ کی وفات میں تین برس تک رہا۔ اس عرصہ میں میری راتیں اس طرح گزرتی تھیں کہ میں نے انھیں تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک تہائی عبادات کے لیے وقف تھی۔ دوسری تہائی میں سونا، اور تیسری تہائی مذاکرہ حدیث میں بسر ہوتی۔

مروان کے کاتب کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ مروان نے انھیں امتحان کی غرض سے بلوایا اور مجھے تخت کے نیچے بٹھا دیا۔ یہ حدیثیں بیان کرتے جاتے تھے اور میں چپکے چپکے لکھتا جاتا تھا۔ دوسرے سال پھر انھیں بلایا اور ان سے حدیثیں سنیں۔ یہ حدیثیں بلاکم وکاست بالکل وہی تھیں جن کو ایک سال قبل بیان کیا گیا تھا۔ لطف یہ ہے کہ ترتیب بیان میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ ان کے شوق علم، ذوق حدیث، تلاش وجستجو اور حفظ وصیانت سنن کے جذبے نے اس علم کو بلا کی وسعت عطا کر دی تھی۔ امام بخاری کا قول ہے تقریباً آٹھ سو صحابہ وتابعین نے ان سے روایت کی۔ ان رواۃ میں فقہ وحدیث کے بڑے بڑے ائمہ شامل ہیں۔ جیسے:

بشر بن نہیک، الحسن البصری، زید بن اسلم، زید بن ابی عتاب، سعید المقبری، سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار، شفی ابن ماتع، شہر بن جوشب، عامر الشعبی، عبداللہ بن سعد مولی عائشہ، عبداللہ ابن عتبہ الہذلی، عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج، عبدالعزیز بن مروان، عروہ بن زبیر، عطا بن ابی رباح، عطا بن یسار، قاضی مدینہ عمر بن خلدہ، عمرو بن دینار، القاسم بن محمد، قبیصہ بن ذویب، کثیر بن مرہ، اور محمد بن سیرین، محمد بن المنکدر، مروان بن الحکم، میمون بن مہران، ہمام بن منبہ، ابو ادریس الخولانی، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، ابوسعید المقبری، ابوصالح السمان وغیرہ۔

حضرت ابوہریرہ کثیر الروایۃ ہیں۔ امام احمد نے اپنی مسند میں ان کی (۳۸۴۸) مرویات درج کی ہیں، جن میں مکررات بھی اچھی خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ امام بقی بن مخلد کی مسند میں ان کی (۵۳۷۴) مرویات مندرج ہیں اور صحیحین میں کل (۳۲۵) روایات مذکور ہیں۔

جن روایات کو امام بخاری نے ان سے منفرداً بیان کیا ہے ان کی تعداد (۹۳) سے زیادہ نہیں۔ ان کے علم وفضل کے اعتراف میں صحابہ اور اعلام محدثین نے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ کا کہنا ہے کہ ابوہریرہ کو ہم سب سے بڑھ کر آنحضرتؐ کے دربار گھربار میں رسائی حاصل کی تھی اور حدیث کے بارے میں ان کا علم سب سے زیادہ تھا۔

ایک روایت عبداللہ بن عمر کا یہ قول مذکور ہے:

ابوھریرۃ خیر منی واعلم مایحدث۔

ابوہریرہ مجھ سے بہتر ہیں اور حدیث کے معاملہ میں اعلم الناس۔

ابی بن کعب نے ان الفاظ میں ان کی تعریف کی:

کان ابوھریرۃ جریئا علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسئالہ عن الاشیاء لانسئلہٗ عنہا۔

ابوہریرہ جستجو کے علم میں جری تھے۔ آنحضرتؐ سے یہ ایسے ایسے سوال کرتے جو ہم نہیں کر پاتے تھے۔

جنازے کی مشایعت کے بارے میں انھوں نے ایک حدیث بیان کی حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس پر حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے استصواب چاہا۔ آپ نے فرمایا:

صدق ابوھریرۃ۔

ابوہریرہ نے سچ کہا ہے۔

طلحہ بن عبیداللہ کا قول ہے۔

لاشك انه سمع مالم نسمع۔

اس میں کوئی شبہ نہیں۔ انھوں نے آنحضرت سے وہ کچھ سنا جو ہم نے نہیں سنا۔

ابوصالح السمان نے کہا:

کان ابوھریرہ من احفظ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

ابوہریرہ آنحضرتؐ کے صحابہ میں سب سے زیادہ حدیث کو یاد رکھنے والے تھے۔ قریب قریب انہی الفاظ میں امام شافعی اور امام بخاری نے ان کے حفظ و اتقان کا ذکر کیا ہے۔

علامہ ذہبی اپنے تذکرے میں رقمطراز ہیں کہ ابوہریرہ علم کا ظرف تھے اور صاحب افتا ائمہ کے گروہ میں بلند پایہ رکھتے تھے۔

حافظ ابنِ کثیر کا قول ہے:

کان ابوھریرۃ من الصدق والدیانۃ والعبادۃ والزھادۃ والعمل الصالح علی جانب عظیم۔

ابوہریرۃ، صدق، دیانت، عبادت، زہد اور عمل صالح میں بہرہ وافر رکھتے تھے۔

ابن حجر العسقلانی کہتے ہیں۔ ابوہریرہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے حافظ تھے، اور صحابہ میں ان کے سوا کسی نے بھی احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم نہیں کیا۔

حضرت ابوہریرہ کو خود بھی اپنے کمال کا احساس تھا چنانچہ ایک مرتبہ اس کا اظہار بھی کیا۔ فرمایا۔ آنحضرتؐ کے صحابہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا، جس کو مجھ سے زیادہ احادیث حفظ ہوں۔

علالت و وفات: ہشام بن عروۃ تصریح کی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور ابوہریرہ نے ۵۷ھ میں اس دارفانی کو چھوڑا اور راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ بیمار پُرسی کو لوگ آتے تھے اور صحت یابی کے لیے دعا کرتے تھے، لیکن ان کی دلی کیفیت یہ تھی کہ اس دنیا سے ان کو کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ آرزو تھی تو صرف یہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس زندانِ خاکی سے رہائی حاصل کریں اور عالم جاودانی کو سدھاریں۔

علالت کے دوران منازلِ آخرت کو یاد کرکے اکثر روتے تھے۔ کہتے تھے، میں دنیا کی دلفریبیوں سے محروم ہو جانے کے خطرے کے پیشِ نظر نہیں روتا، روتا اس لیے ہوں کہ سفر طویل ہے اور زادِ راہ کم۔

ولید نے نماز جنازہ پڑھائی، جنازے میں عبداللہ بن عمر اور ابوسعید خدری

نے شرکت کی۔ حضرت عثمان کے صاحبزادوں نے کندھا دیا، اور جنت البقیع میں سپردِ خاک کیا۔

صحیح تر طرقِ روایت: اس مخزنِ علم اور معدنِ حدیث سے متعدد لوگوں نے روایت کی۔ سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں اصح الطرق کا اطلاق کن وسائط و ذرائع پر ہوتا ہے۔ ابن المدینی کا کہنا ہے:

حماد بن زید عن ایوب عن محمد بن سیرین عن ابی ھریرۃ۔

کا طریق روایت علی الاطلاق زیادہ صحت کا حامل ہے۔

سلیمان بن داؤد نے اصح الاسانید کا سرچشمہ ان روایات کو قرار دیا، جو یحییٰ بن ابی کثیر عن ابی سلمہ عن ابی ہریرہ سے مروی ہوں۔

ان کے علاوہ محدثین نے مندرجہ ذیل طریق کی بھی توثیق کی ہے اور ان کو صحیح تر طرق روایت ٹھہرایا ہے:

الزھری، عن سعید بن المسیب عن ابی ھریرۃ۔

ابی الزناد عن الاعرج۔ عبد الرحمٰن بن ھرمز۔ عن ابی ھریرۃ

مالک عن الزھری عن سعید بن المسیب عن ابی ھریرۃ۔

سفیان بن عیینۃ عن الزھری عن سعید المسیب عن ابی ھریرۃ۔

اسماعیل بن ابی حکیم عن عبیدہ بن سفیان الحضرمی عن ابی ھریرۃ۔

معمر عن ھمام بن منبہ عن ابی ھریرۃ۔

یہ ہے حضرت ابوہریرہ کی تصویر کا وہ صحیح رُخ جس کی تاریخ، احادیث اور سیر کی کتابوں سے تائید ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صحابہ اور اعلام تابعین کی نظر میں ان کا پایہ کس درجہ بلند تھا۔

آئیے! اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں، اور اس بات کا جائزہ بھی لیں کہ

برخود غلط اور علمائے مغرب کی تحریروں سے مرعوب ومتاثر گروہ نے ان کی ذاتِ گرامی کو کس کس پہلو سے ہدفِ تنقید ٹھہرایا ہے۔ ان کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے:

۱- جاہلیت میں ان کا کیا نام تھا۔ اس میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اپنی قوم میں قطعی غیر معروف اور غیر معزز شخصیت کے حامل تھے۔

۲- یہ آنحضرتؐ کی صحبت میں بہت کم عرصے تک رہے لیکن اس کے باوجود کثیر الروایۃ ہیں۔

۳- ان کے ہاں احادیث کے ذخیرے کو قلم بند نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ یہ صرف قوتِ حفظ کے بل بوتے پر روایات بیان کرتے تھے۔

۴- ان کی روایات میں اس بات کا التزام نہیں پایا جاتا کہ یہ صرف وہی احادیث بیان کریں جو انھوں نے آنحضرتؐ سے سنی ہیں۔ کیونکہ یہ دوسرے صحابہ سے بھی روایت کرنے کے عادی ہیں۔

۵- حضرات حنفیہ ان کو غیر فقیہ قرار دیتے ہیں اور ان کی روایت کو اس صورت میں رد کر دیتے ہیں جب یہ قیاس کے خلاف ہو۔

۶- یہ چونکہ کثیر الروایۃ ہیں، اس لیے واضعین حدیث کو خواہ مخواہ موقع ملا ہے کہ وہ ان کی طرف جھوٹی حدیثیں منسوب کریں۔

۷- حضرت عمر نے انھیں اپنے عہد میں روایت و تحدیث کے عمل سے روک دیا تھا۔

۸- انھوں نے بنی امیہ کی تعریف و حمایت کی ہے۔

جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے۔ اس کی تہ میں یہ شبہ پنہاں ہے کہ چونکہ عہدِ جاہلیت میں ان کے نام کی تعیین ٹھیک نہیں ہو پاتی۔ اس لیے یہ اپنی قوم یا قبیلہ میں مجہول الاسم یا غیر معروف شخصیت کے حامل تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے نام میں

اختلاف رونما ہوا ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا ہزاروں صحابہ جو اسلام کی آغوش میں آئے ان کے بارے میں ہمیں وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ جاہلیت میں وہ کس نام سے پکارے جاتے تھے۔

مزید برآں مورخین نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ ان کا مشہور ترین نام عبدشمس بن صخر تھا، اور آنحضرتؐ نے ان کا نام عبدالرحمٰن تجویز فرمایا۔

اس سلسلے میں دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ آیا مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد بھی۔ یہ پہلے کی طرح خامل الذکر اور گم نام ہی رہے یا شہرت و ناموری نے ان کے قدم چومے۔ اگر جاہلیت میں انھوں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تو یہ بھی قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ دربارِ نبوت میں پہنچ کر انھوں نے کیا مقام حاصل کیا اور اکابر صحابہ نے ان کو کس وقعت و درجہ کا سزاوار سمجھا۔ ان کے زہد و ورع، ذکاء حفظ اور دوسرے اخلاق و شمائل کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہم کر چکے ہیں۔ ان سب چیزوں کو فکر و نظر کے سامنے رکھیے اور پھر بتلائیے کہ ان کی روشنی میں کیا یہ اعتراض کسی صورت میں بھی معقول اور شائستہ اعتنا ہے۔

اور کیا اس حقیقت سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے کہ حضرت ابوہریرہ کو عہدِ جاہلیت میں گم نام قرار دینے والے اسلام کے مزاج اور اس کے تہذیبی پیمانوں سے قطعی ناواقف ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس دین کی رُو سے کسی شخص کے محامد و فضائل کا معیار یہ نہیں کہ اسلام سے قبل معاشرے میں اس کے جاہ و مرتبت کا کیا عالم تھا۔ بلکہ یہ ہے کہ اسلام کی نعمت سے مالا مال ہونے کے بعد اس نے کیا کیا۔ کس طرح اس نے اپنی شخصیت کو نکھارا اور سنوارا کس طرح اس نے اپنے اللہ سے عبودیت و بندگی کا رشتہ جوڑا، اور اس کے رسول کی اطاعت و اتباع میں کس درجہ وارفتگی و شیفتگی کا اظہار کیا۔ اس زاویہ نظر سے دیکھیے تو حضرت ابوہریرہؓ کی عظمت کا راز آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔

دوسرا اعتراض ان کی کثرتِ روایت کے بارے میں ہے۔ اس میں کوئی

شبہ نہیں کہ باوجود اس کے کہ انصار و مہاجرین میں متعدد جلیل القدر صحابہ ایسے ہیں جنھیں آنحضرتؐ کی خدمت میں باریابی کا فخر حاصل تھا، لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو کثرت روایت میں ان کا مقابلہ کر سکے۔ بظاہر یہ امر تعجب خیز ہے۔ اور خود حضرت ابوہریرہ کو بھی اس کا احساس تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ لوگ اس پر معترض ہیں کہ میں بہت حدیثیں بیان کرتا ہوں۔ حالانکہ مہاجرین اور انصار ان حدیثوں کو بیان نہیں کرتے۔ مگر ان لوگوں کو اس بات کو بھی تو مدِّ نظر رکھنا چاہیے کہ مہاجرین کو یہ موقع ہی کب میسر تھا، وہ تو بازاروں میں اپنے کاروبار میں مشغول رہتے۔ انصار کو اپنی زراعت کی فکر لگی رہتی۔ میں مسکین آدمی تھا میرا تمام تر وقت آنحضرتؐ کی صحبت میں کٹتا۔ نیز مجھے آنحضرتؐ کے ساتھ نشست و برخاست کے بھی ان سے زیادہ مواقع ملے۔ میں اس وقت بھی دربارِ رسالت میں حاضر باش رہتا تھا، جب یہ لوگ موجود نہ ہوتے تھے اور آنحضرتؐ کے ان ارشادات کو یاد رکھتا تھا، جن کو یہ بھلا دیتے تھے۔

کبار صحابہ بھی حضرت ابوہریرہ کی اس توجیہ کی تصدیق کرتے رہتے تھے۔ ابو عامر کہتے ہیں۔ میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ کے پاس بیٹھا تھا کہ اس اثنا میں ایک صاحب نے آکر کہا کہ اے ابو محمد! یہ تو بتائیے کہ کیا یہ یمنی (ابوہریرہ) اقوالِ نبوی کا بڑا حافظ ہے یا تم لوگ۔ انھوں نے جواب میں کہا اس میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کو بہت سی ایسی حدیثیں سننے کا موقع ملا، جو ہم نہیں سن پائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ صاحب جائداد تھے۔ ہمارے گھر بار اور اہل و عیال تھے ہم ان میں مصروف رہتے۔ صرف صبح اور شام کو آنحضرتؐ کے ہاں حاضری دیتے، اس کے بعد لوٹ جاتے، اور ابوہریرہ مسکین تھے، ان جھنجھٹوں سے یکسر آزاد تھے، اس لیے آنحضرتؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے۔ اس میں کوئی شک نہیں ان کو سب سے زیادہ احادیثِ رسول سننے کا اتفاق ہوا اور ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں جو انھوں نے آنحضرتؐ سے

نہیں سنیں۔

اکثر کہا کرتے تھے کہ بخدا قرآنِ حکیم میں اگر یہ آیت نہ ہوتی تو میں تمھیں کبھی حدیثِ رسول سنانے کی جرأت نہ کرتا، اور پھر یہ آیت پڑھتے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝

(البقرہ: ۱۵۹)

جو لوگ ہمارے حکموں اور ہدایتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم نے ان لوگوں کے سمجھانے کے) لیے اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے ایسوں پر خدا اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔

ان تصریحات سے حضرت ابوہریرہ کے متعلق یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کو دوسرے صحابہ سے دبستانِ نبوت کی خوشہ چینی کے نسبتاً زیادہ مواقع ملے۔ یہ دامانِ رسالت سے کچھ اس طرح وابستہ ہوئے کہ نہ صرف جیتے جی اس سے دست بردار نہیں ہوئے، بلکہ جلوت خلوت، سفر، حضر اور غزوات و مہمات میں آنحضرتؐ کے برابر ہم رکاب رہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ ان کے سامنے بجز حصول علم کے اور کوئی نصب العین ہی نہ تھا جس کو پانے کے لیے یہ کوشاں رہے۔ یہ نہ دولت و ثروت کے خواہاں تھے۔ نہ جاہ جلال کے، نہ مال تجارت سے دلچسپی رکھتے تھے اور نہ زراعت اور کھیتی باڑی سے کوئی سروکار۔ ایک ہی دھن ان پر سوار تھی، جو یہ تھی کہ آنحضرتؐ نے سنت کی جو شمع روشن کی ہے اس کی ایک ایک کرن کو بحفاظت تمام دوسروں تک پہنچایا جائے۔ تاکہ وہ اس کی ضوء اور لو سے قلب و ذہن کو منور و مستنیر کر سکیں، اور یہ دیکھ سکیں کہ آنحضرتؐ کی زندگی کس نہج اور اسلوب سے بسر ہوئی، اور عبادات سے لے کر معاملات تک میں آپ نے کیونکر ہدایت و رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔

یہ درست ہے کہ صحابہ میں بعض حضرات نے ان کی کثرت روایت پر بظاہر

تعجب کا اظہار کیا، لیکن اس کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ کسی نے بھی ان کی تکذیب کی یا روایات کے سلسلے میں ان کو متہم گردانا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جب اپنے کثیر الروایت ہونے کی مذکورہ بالا توجیہ بیان کی تو سب مطمئن ہو گئے، اور صحابہ و تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت نے ان کے مرویات کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ بجائے اس کے کہ احادیث کو قلم بند کرتے اور قید تحریر میں لاتے، اور پھر اپنے تحریری مسودے کو سامنے رکھ کر روایت کرتے۔ اکثر اپنے حافظہ و ذاکرہ ہی پر اعتماد کرتے اور انہی کے بل پر احادیث بیان کرتے۔ سوال یہ ہے کہ اس بارے میں حضرت ابوہریرہ منفرد کب ہیں۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص کے علاوہ متعدد صحابہ کا یہی جانا بوجھا معمول تھا۔ جن لوگوں نے حدیث کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ صحابہ و تابعین میں اکثریت ایسے حضرات کی ہے جو احادیث کو رقم نہیں کرتے تھے۔ یہی نہیں، ان کے ہاں کتابت و تحریر سے کہیں زیادہ حفظ کو ترجیح دی جاتی تھی، اس لیے کہ تحریر و کتابت میں بہرحال غلطی اور تصحیف کا امکان ہے اور حافظہ میں یہ احتمال نہیں پایا جاتا۔ بشرطیکہ حافظ حدیث امانت و صدق میں مشہور ہو، اور حفظ و اتقان میں بلند پایا ہو۔ اسی بنا پر بعض علمائے اصول کا کہنا ہے کہ جب دو حدیثوں میں تعارض رونما ہو تو دیکھا جائے گا کہ ان میں کون مسموع ہے اور کون مکتوب۔ مسموع کو مکتوب پر ترجیح دی جائے گی۔

اس اعتراض کی تہ میں دراصل یہ شبہ کارفرما ہے کہ اتنی ساری احادیث کو ذہن میں محفوظ رکھنا کیونکر ممکن ہے لیکن یہ معترضین اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حفظ و ذاکرہ کی استواری و پختگی عربوں کا وہ قومی امتیاز تھا، جس پر وہ ہمیشہ نازاں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ، تابعین اور محدثین میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو غیر معمولی حافظہ سے بہرہ مند تھے۔ امام بخاری کو تین لاکھ احادیث مع اسناد یاد تھیں۔ امام احمد بن حنبل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چھ لاکھ احادیث ان کے سینہ

صافی میں محفوظ تھیں، اور ابی زرعہ سے متعلق منقول ہے کہ انھیں سات لاکھ احادیث حفظ تھیں۔ اور پھر دبستانِ احادیث سے نکل کر اگر ادب و شعر کی وادی میں قدم رکھیے تو یہاں متعدد ایسے افراد دکھائی دیتے ہیں، جو نہ صرف عربی نظم و نثر پر عبور و قدرت رکھتے تھے بلکہ ہزاروں اشعار اور نثر کی بہت بڑی مقدار پر ان کو استحضار حاصل تھا۔ اصمعی ہی کو لے لیجئے۔ رواۃ کا کہنا ہے کہ پندرہ ہزار اشعار ان کو زبانی یاد تھے۔ اور دور کیوں جائیے۔ ہمارے دور ہی کے دو فاضل بزرگ علامہ شنقطی اور علامہ عبد العزیز میمنی ایسے ہیں جو اپنے غیر معمولی حافظہ کی وجہ سے مشہور ہیں۔

اول الذکر کو علاوہ جاہلیت کے تمام اشعار کے، ابو العلا المصری کا پورا کلام ازبر تھا، اور ثانی الذکر سے جب ایک مجلس میں پوچھا گیا کہ آپ کو جاہلیت اور عہدِ اسلامی کے کتنے اشعار یاد ہیں، تو انھوں نے فرمایا، قریب قریب ایک لاکھ۔

ان شواہد سے غور کیجیے تو صرف حضرت ابو ہریرہ کی استعداد حفظ قطعی محل اعتراض و استعجاب نہیں رہتی۔

چوتھے اعتراض کے بارے میں ہمیں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا ہے کہ یہ بھی معمولات صحابہ میں سے ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بلا محابہ روایت کریں اگرچہ ان کو آنحضرت سے براہ راست سماع کا موقع نہ ملا ہو۔ ایسی روایات کو محدثین کی اصطلاح میں مراسیل صحابہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور احادیث کی یہ نوعیت محدثین کے ہاں مستند اور حجت سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں اور کوئی بھی ان میں ایسا نہیں ہے جسے متہم گردانا جائے یا ان کو اس معاملے میں کاذب قرار دیا جائے۔

حضرت انس رض سے مروی ہے:

ما کل ما نحدثکم بہ عن رسول اللہ سمعناہ منہ، ولکن لم یکن یکذب بعضنا بعضاً۔

وہ تمام حدیثیں جو ہم آنحضرت سے روایت کرتے ہیں ضروری نہیں کہ

سب کی سب سماع ہی پر مبنی ہوں۔ (یعنی ہم ایک دوسرے سے روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے) لیکن ہم میں سے کوئی شخص بھی دوسرے کی تکذیب نہیں کرتا۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خود صحابہ کے حلقوں میں یہ جانا بوجھا اصول رائج تھا کہ الصحابۃ کلہم عدول۔ اور ایسی روایات پر بغیر کسی شک و شبہ کے اظہار کے مہر تصدیق ثبت کی جاتی تھی، جو آنحضرتؐ سے بالواسطہ مروی ہوں، اور ان میں سماع کا ذکر نہ ہو۔

پانچویں اعتراض کا منشا یہ ہے کہ چونکہ حضرات حنفیہ حضرت ابوہریرہؓ کو فقیہ تسلیم نہیں کرتے، اس لیے ان کی مرویات کو جب وہ قیاس صحیح سے ہم آہنگ نہ ہوں رد کر دیتے ہیں۔

یہ الزام دو وجہ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ جمہور حنفیہ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ خبر بہر حال قیاس کے مقابلے میں زیادہ قابلِ استناد ہے، چاہے راوی فقیہ ہو، یا غیر فقیہ۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور اہلِ اصول میں سے اکثر کی رائے یہی ہے۔ حتیٰ کہ فخر الاسلام اور ان کے صاحبین ابن ابان اور ابو زید کا موقف بھی یہی ہے کہ حدیث و خبر کو قیاس پر تقدم حاصل ہے۔ ہاں اگر حدیث قیاس و رائے کے تمام پیمانوں کے خلاف ہو اور اس سے قیاس و رائے کی راہیں یکسر مسدود ہو جاتی ہوں تو اس صورت میں البتہ قیاس کو مقدم ٹھہرایا جائے گا۔ ان کی رائے میں حدیث مصراۃ، جو حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ چونکہ بالکلیہ قیاس و رائے کے تقاضوں سے متصادم ہے۔ اس لیے لائقِ قبول نہیں۔ حدیث "مصراۃ" یوں ہے:

لا تصروا الابل والغنم من ابتاعها بعد ذٰلک فهو بخیر النظرین بعد ان یحلبها فان رضی امسکها۔ وان سخطها ردها۔ وصاعا من تمر۔

اونٹنی اور بھیڑ بکری کا دودھ روک نہ رکھو۔ جو شخص اس کے بعد بھی ان میں سے کسی کو خرید لیتا ہے اور اس سے دودھ حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے

لیے دو راستے ہیں۔ یا تو اس سودے پر اگر خوش ہے تو اسے اپنے قبضے میں رکھے۔ اور اگر خوش نہ ہو تو مالک کو ایک صاع کھجور دے کر اسے لوٹا دے۔

فخر الاسلام اور ان کے صاحبین کا کہنا ہے کہ مذکورہ صورت میں جب کہ مشتری سودا فسخ کر دیتا ہے دودھ کا حصول ایک طرح کی تعدی یا زیادتی ہے جس کی تلافی یا بالمثل ہوتی ہے یا نقدی کی شکل میں اور اس حدیث میں چونکہ ان میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کی گئی، اس لیے یہ قیاس و رائے کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔

ہماری رائے میں اس حدیث کے بارے میں یہ اندازِ فکر صحیح نہیں۔ یعنی یہ کہ اس کو جملہ فقہی توجیہات کے منافی قرار دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اس سے رائے اور قیاس کے دروازے بالکلیہ بند ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ شرعی اعتبار سے جزئیات و فروع میں کبھی تو مصرحہ علل و اسباب کی بنا پر حکم کا تعین کیا جاتا ہے، اور کبھی محض مصالح کی بنا پر۔ اس مقام پر شارع کے حکم میں یہ مصلحت پنہاں ہے کہ فریقین میں چونکہ اس مسئلہ میں نزاع اور اختلاف رونما ہے۔ اس لیے اس کو ایسے طریق سے نمٹایا جائے جو حد درجہ سہل اور آسان ہو، اور ظاہر ہے کہ حدیث مصراۃ میں جھگڑے کو نمٹانے کی جو صورت پیش کی گئی ہے وہ حد درجہ آسان اور سہل ہے۔ نیز اس باب میں یہ چیز بھی جاننے کی ہے کہ امور و معاملات میں سہولت و یسر کو ملحوظ رکھنا اسلامی قانون و تشریع کا وہ امتیاز ہے جس میں کوئی مذہب اس کا شریک و سہیم نہیں۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھیے تو حدیث مصراۃ کی فقہی توجیہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

دوسری وجہ جس کی بنا پر ہم اس اعتراض کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے یہ کہ حضرت ابوہریرہ کبار صحابہ کی زندگی میں صاحب فتویٰ کی حیثیت سے مشہور تھے۔ چنانچہ قریباً بیس سال تک معاشرہ میں پیش آمدہ مختلف مسائل کے بارے میں یہ فتوے دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے، ابن حزم نے صحابہ میں جن تیرہ صاحبِ فتویٰ

کا ذکر کیا ہے، ان میں ان کا نام نامی بھی درج ہے۔

مسئلہ زیر بحث کی تفصیل کے لیے اس نکتہ پر غور کرنا ضروری ہے کہ جس شخص کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے احادیث رسول کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا اور امت تک پہنچایا ہے وہ فقہی بصیرت و تدبر سے کیونکر محروم رہ سکتا ہے۔

کیا علم حدیث فی ذاتہ فقہ و تدبر پر مبنی نہیں، کیا حکمت نبوی کے مطالعے، تدریس اور مزاولت سے غور و فکر کے داعیے آپ سے آپ نہیں ابھرتے اور تعقل و تفہیم کے دریچے خود بخود وا نہیں ہوتے۔ یعنی کیا علم حدیث کے حصول کے معنی صرف الفاظ و حروف کے ضبط و اتقان کے ہیں، جن کی تہہ میں کوئی اصول، کوئی پیمانہ اور حکمت پائی نہیں جاتی۔ یا دوسرے لفظوں میں محدثین سے مراد صرف یہ ہے کہ یہ لوگ "صیادلہ" کی حیثیت رکھتے ہیں، جو دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے اپنی دکان سجاتے ہیں۔ اور یہ مقام فقہائے امت کو حاصل ہے کہ وہ اطبا اور معالج ہوں۔ اور ان دواؤں اور جڑی بوٹیوں کو سلیقے سے برتیں، اور استعمال میں لائیں۔ ہمارے نزدیک حدیث و فقہ کے مابین یہ غیر منطقی تقسیم ہے حدیث جہاں روایت سے تعبیر ہے وہاں چونکہ اس کا انتساب آنحضرت سے ہے جن کا ہر حکم حکمت و دانش پر مبنی ہے۔ اس لیے یہ فکر و نظر کی ایک روشنی بھی ہے اور اس کے تعلیم و تعلم اور اس کی غواصی و مطالعہ سے انسان میں وہ ملکہ و ذوق بھی پیدا ہوتا ہے جو مسائل کے حل و کشود میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

جن لوگوں نے احادیث کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ان میں صرف احکام و اوامر ہی پائے نہیں جاتے، بلکہ وہ اصول، پیمانے اور وہ معیار بھی مذکور ہیں، جن کے بل پر فقہا کرام نے آیندہ چل کر تشریع و تقنین کے بیش قیمت خزائن ترتیب دیے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ محدثین اور فقہا میں جو فرق ہے وہ یہ نہیں کہ ہر اعتبار سے یہ دو الگ الگ اور باہم مخالف گروہ ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ان میں فرق و امتیاز کی نوعیت یہ ہے کہ محدثین نے اگر احادیث کی

عمومی روح اور معنی کو سمجھ کر مختلف احوال اور مناسبتوں میں استدلال و استنباط سے کام لیا ہے تو فقہا نے اس روح و معنی کو باقاعدہ فن کی روشنی میں متعین کیا ہے۔ گویا ان دونوں میں فرق نوعیت یا جوہر و اساس کا نہیں، کیفیت کا ہے۔ معنی و دلیل کا نہیں اصطلاح و فن کا ہے۔

حضرت ابوہریرہ کو غیر فقیہ قرار دینا اس اعتبار سے بھی غلط ہے کہ ان کی حیثیت صرف راوی یا حافظِ حدیث کی نہیں، ایسے مقتدر اور سربرآوردہ صحابی کی ہے، جنھوں نے آنحضرتؐ کی ادا ہائے دلنواز کو بہت قریب سے دیکھا، اور وحی اور تنزیل کی ضوفشانیوں سے براہِ راست استفادہ کیا۔ اس پر مستزاد یہ انھوں نے آنحضرتؐ کے ارشادات و اقوال کو نہ صرف سنا اور یاد رکھا بلکہ اس پس منظر اور موقع محل کو بھی بچشمِ خود دیکھا کہ جس کے پیشِ نظر ان کے اظہار و بیان کی آنحضرتؐ کو ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لیے یہ خوب جانتے تھے کہ مختلف احادیث روایات کا محل اطلاق کیا ہے۔ ان کو کس محمل پر محمول کرنا چاہیے۔ دین کے معاملے میں یہی وہ تفقہ و بصیرت ہے، جس سے حضرت ابوہریرہؓ بہرحال بہرہ مند تھے۔

چھٹا اعتراض اس وضع و تزویر سے متعلق ہے جس کو حضرت ابوہریرہؓ کے بعد آنے والے بعض غیر ذمہ دار رواۃ نے اختیار کیا۔ اس اعتراض کو پہلے پہل گولڈزیہر نے اچھالا، اور اس کے بعد احمد حسین نے اسے بڑے طمطراق سے پیش کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں حضرت ابوہریرہ کا کیا قصور ہے اور صرف انھیں کو اس بارے میں کیوں ہدفِ طعن ٹھہرایا گیا ہے۔ کیا وضاعین نے حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت انسؓ کی شہرت و مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی طرف یکسر غلط اور جھوٹی روایات منسوب نہیں کیں، اور کیا تاریخ کا یہ تمہ گیر المیہ نہیں کہ جب بھی کوئی شخص، تفسیر، حدیث یا ادب و شعر کی دنیا میں

ناموری حاصل کرتا ہے تو کچھ لوگ نہ صرف ان اشخاص کے متعلق غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں بلکہ ان فنون میں اپنی ذاتی آرا کو داخل کر دینے کی مذموم کوشش بھی کرتے ہیں۔ اور اس طرح الحاق، اختلاق اور وضع و تزویر کے ایسے ایسے عجیب و غریب نمونے سامنے آتے ہیں، جن کو اگر صحیح مان لیا جائے تو ان سے ان بلند مرتبہ حضرات کا تشخص ہی معرض شک میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے محدثین کرام نے ہمیں اس ابتلا سے بچا لیا ہے۔ انھوں نے روایات و احادیث کی جانچ پرکھ کے لیے ایسے جچے تلے اور منظم و معقول طریقِ کار کی نشاندہی کی ہے جو بجائے خود ایک سائنس ہے اور اسے اس طرح تکمیل و اتمام کی منزلوں تک پہنچایا ہے کہ اس کو اختیار کرنے کے بعد اس بات کا قطعی احتمال باقی نہیں رہتا کہ کوئی موضوع حدیث اہلِ علم کی نظروں سے اوجھل رہ سکے۔ یا کوئی جھوٹا اور وضاع شخص محدث و راوی کا لبادہ اوڑھ کر ثقاہت و استناد کے پُرشکوہ درجہ پر فائز ہو جائے۔ ہر شخص جس نے حدیث و رجال کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ محدثین نے ہر دور میں ان لوگوں کو بے نقاب کرنے اور ان کے مذموم عزائم کو واشگاف طور پر بیان کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، جنھوں نے احادیث و روایات کی مقدس امانت میں خیانت کا ارتکاب کیا یا لوگوں کو دھوکا دیا ہے۔ یہی نہیں ان حضرات نے ازراہِ احتیاط صحابہ و تابعین کے بارے میں اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ ان کے کون کون تلامذہ ایسے ہیں، جن پر ان کی مرویات کے سلسلے میں اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ نقد و تفحص اور تثبت و احتیاط کی ان ساری تدبیروں اور پیمانوں کو فکر و نظر کے سامنے رکھیے، اور پھر ایمانداری سے بتائیے کہ ان کو ملحوظ دم رکھنے سے کیا، احادیث کے سلسلے میں وضع و افترا کی کوششیں کسی مرحلے میں بھی بارآور ہو سکتی ہیں، جن کو اہلِ اہوا اور بندگانِ ہوس نے روا رکھا۔

اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے پاس ایسے علمی ذرائع موجود ہیں، جن کی مدد سے ان کی مرویات میں سے صحیح کو غیر صحیح

سے الگ کیا جا سکتا ہے اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ فلاں روایت کا ان کی طرف انتساب درست ہے اور فلاں کا انتساب درست نہیں۔

ساتواں اعتراض یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی نگاہِ احتساب نے بھانپ لیا تھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ آنحضرتؐ سے روایت کرنے کے سلسلے میں محتاط نہیں ہیں۔ اس بنا پر انھیں روایت و تحدیث کے عمل سے روک دیا تھا۔

یہ اعتراض دراصل غلط فہمی پر مبنی ہے کہ حضرت عمرؓ روایت و تحدیث کے بارے میں خاصے متشدد تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی غلط روایت آنحضرتؐ سے خواہ مخواہ منسوب ہو جائے۔ یا کوئی شخص احادیث کی آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کے خلاف تعبیر کرے۔ یہی وجہ ہے اقلال روایت کے مسلک پر سختی سے کاربند تھے اور اس وقت تک کسی حدیث و روایت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے، جب تک انھیں یقین نہ ہوتا کہ آنحضرتؐ نے واقعی یوں فرمایا ہوگا۔ یہ محض تثبت و احتیاط کی وجہ سے تھا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ حدیث و روایت کی اشاعت و فروغ کے سرے سے مخالف تھے۔ یا یہ کہ صحابہ میں بعض کو اس بارے میں خصوصیت سے متہم گردانتے تھے۔

جہاں تک حضرت ابو ہریرہؓ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے۔ ان سے متعلق تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ نے انھیں حدیث بیان کرنے سے مطلقاً منع کر دیا ہوگا۔!

بات صرف یہ ہے کہ جس طرح حضرت عمر نے روایتِ التنبیئذان کو ابتداءً تسلیم نہیں کیا لیکن جب ان کو یقین ہو گیا کہ ان کے حفظ و اتقان پر پوری طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے تو روایتِ حدیث کی واضح الفاظ میں انھیں اجازت دے دی۔ چنانچہ خود ان کا کہنا ہے:

بلغ عمرؓ حدیثی فارسل الی، فقال کنت معنا یوم کنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی بیت فلان؟ قال قلت نعم! وقد

علمت لم تسئلنی عن ذٰلک ۔قال ولم سألتک ؟ قلت ! ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال یومئذٍ "من کذب علیّٰ متعمدًا فلیتبوأ مقعدہ من النار" قال اما اذن فاذھب فحدث۔

حضرت عمرؓ کے علم میں جب یہ بات آئی کہ میں آنحضرت سے براہِ راست روایت بیان کرتا ہوں تو انھوں نے ازراہِ تصدیق ایک صاحب کو میرے ہاں بھیجا اور پوچھا، کیا تم اس وقت فلاں شخص کے گھر موجود تھے، جب ہم سب وہاں رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے تھے ــ ابوہریرہ کا کہنا ہے ۔ میرا جواب یہ تھا کہ جی ہاں ! اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا، کیوں پوچھ رہا ہوں ؟ میں نے کہا کہ اس روز رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "جس شخص نے عمدًا میرے بارے میں جھوٹ بولا ۔ اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے"۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا (میرا اطمینان ہوگیا) اب تمھیں اجازت ہے کہ احادیثِ رسول بیان کرو۔

آٹھویں اعتراض میں انھیں بنو اُمیہ کا مدح خوان اور حامی قرار دیا گیا ہے یہ اعتراض بھی ہمارے نزدیک دوسرے اعتراضات کی طرح بے بنیاد اور غلط ہے اس لیے کہ حق پرستی اور جرأت وبے باکی ہمیشہ ان کا شیوہ رہا ہے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ کبھی بھی صحابہ کے باہمی مشاجرات میں فریق نہیں بنے ــ رہے بنو امیہ کی حمایت ونصرت کے فسانے ۔ سو وہ محض افترا ہیں ۔ اصل واقعہ یا حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ ان کا دل اہلِ بیت کی محبت سے معمور تھا۔ حضرت حسنؓ کا جب انتقال ہوا تو ان کی یہ تجویز تھی کہ انھیں آنحضرتؐ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) کے پہلو میں دفن کیا جائے ۔ مروان نے جو ان دنوں مدینے کا حاکم تھا اس کی مخالفت کی یہ ابوہریرہ ہی تھے جنھوں نے سختی سے اسے ڈانٹا اور کہا :

واللّٰہ ما انت بوالٍ وان الوالی لغیرک فدعہ ولکنک تدخل فیما لا یعنیک انما ترید بھذا ارضاء من ھو غائب ۔ یعنی معاویہؓ ۔

بخدا! تم حاکم نہیں ہو۔ حاکم تمہارے سوا کوئی دوسرا ہے۔ تم اس معاملے میں دخل اندازی نہ کرو، لیکن تمھاری تو عادت ہی یہ ہے کہ ایسے امور میں مداخلت کرتے ہو جن سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تم اس طرزِ عمل سے ایسے شخص کی خوشنودیِ مزاج کے خواہاں ہو جو یہاں موجود نہیں ہے۔ یعنی معاویہؓ۔

بنی امیہ سے ان کے تعلقات کسی حد تک ان کے جذبۂ حق گوئی کو متاثر کر سکے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک مرتبہ انھیں مروان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا کہ یہاں دیواریں بوقلموں تصویروں سے آراستہ ہیں۔ فرمایا! میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

ومن اظلم ممن ذھب یخلق خلقا کخلقی فلیخلقو اذرۃ۔

اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے، جو میری مخلوق کی طرح مخلوق بناتا ہے۔ اگر دعویٰ خدائی ہے تو ایک ذرہ ہی پیدا کر کے دکھائیں۔

امام زہری

حضرت ابو ہریرہؓ کے بعد گولڈ زیہر نے امام زہری کو ہدفِ مطاعن ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ اسے خوب معلوم ہے کہ صحابہ اور تابعین کے مابین انھیں ہمزۂ وصل کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی ایک طرف اگر ان کا دامنِ علم آنحضرتؐ اور صحابہ کے تہذیبی و دینی ورثہ سے مالا مال ہے، تو دوسری طرف ان کی فیض رسانیوں سے تبع تابعین کے حلقہ ہائے علم و فقہ پوری طرح استفادہ کناں ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ احادیث و سنن کے اس درمیانی ستون کو گرا دیا جائے تو اس عظیم المرتبت فن کا سقف و بام آپ سے آپ زمین پر آ رہے گا، جس پر کہ ایمان و عمل کا سارا کارخانہ استوار ہے لیکن یہ اس کی بھول اور خود فریبی ہے۔ اسلام جہاں ایک دین، ایک نظامِ حیات اور زندگی کا ایک مخصوص منہاج اور ڈھنگ ہے وہاں یہ ایک مستند تاریخ بھی ہے جس میں بلا کا تسلسل، ارتباط اور نکھار پایا جاتا ہے، اور تاریخ کے آئینے میں ان تمام چہروں اور شخصیتوں کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے، جنھوں نے علوم و معارف کے خزائن کو ہم تک پہنچانے کی گراں قدر خدمات انجام دیں، اور اگر ہم اس رائے کا اظہار کریں تو قطعی حق بجانب ہوں گے کہ گولڈ زیہر اور دوسرے مستشرقین اسلامی تاریخ و ثقافت کے اس تسلسل اور محکمی نے حسد و بغض کے انگاروں پر لٹا رکھا ہے بلکہ اس غم و اندوہ نے بھی ہلکان کر رکھا ہے کہ ہم نے تو عہد نامہ قدیم سے عہد نامہ جدید تک ہر مذہبی اور دینی تقدس کی حامل کتاب کو تنقید و احتساب کے بے ڈھب تیروں سے چھلنی کر دیا لیکن مسلمان ہیں کہ چودہ سو سال گزرنے پر بھی قرآن و حدیث کو سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔

یہ ہے ان مستشرقین کے دلوں کا اصلی روگ جس کی وجہ سے یہ مجبور ہیں کہ اسلامی علوم و ثقافت کے خلاف نبرد آزما ہوں اور طرح طرح کی سازشوں اور بہانوں سے مسلمانوں میں تشکیک و ارتیاب کے دواعی کو ہوا دیں۔ لیکن اس سلسلے میں ان کا وار اتنا اوچھا اور سطحی ہے کہ پہلی نظر میں اہل نظر بھانپ لیتے ہیں کہ تحقیق اور ریسرچ کے روپ میں یہ جو کچھ کہنا چاہتے وہ سراسر تعصب اور ڈھٹائی پر مبنی ہے۔

امام زہری کے بارے میں ان کے تمام اعتراضات اس کی مذموم ذہنیت کے آئینہ دار ہیں۔ یہ اعتراضات بجائے خود صحت و استواری کے کن پہلوؤں کے حامل ہیں۔ اس سے تعرض کرنے سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ امام زہری کے مرتبہ و مقام کے بارے میں اہلِ فن اور اعلام حدیث و سنت نے جو کچھ کہا ہے، اس کو بلا کم و کاست ناظرین کے سامنے پیش کر دیں تاکہ اہلِ علم کو ان کی شخصیت و منزلت سے متعلق تحقیقی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکے، اور وہ یہ جان سکیں کہ جس شخص کو مستشرقین نے طعن و تشنیع کا ہدف ٹھہرایا ہے وہ کس درجے کا بھاری بھرکم، ثقہ، عالم اور شائستہ اعتماد ہے۔

۱۔ الاوزاعی: میں نے ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں تابعین میں سے کسی کو ان سے بڑا فقیہ نہیں پایا۔

۲۔ ابنِ سعد: زہری ثقہ کثیر الروایۃ، وافر علم سے بہرہ مند اور جامع فقیہ ہیں۔

۳۔ ایوب السختیانی: میرے نزدیک زہری سب سے بڑے عالم ہیں۔ صخر بن جویریہ نے اس بیان سے کہا، کیا ان کا مقام حسن (بصری) سے بھی بڑھ کر ہے۔ انھوں نے کہا، جی ہاں! ان کا مقام ان سے بھی اونچا ہے۔

۴۔ النسائی: زہری کا سلسلہ اسناد بہترین اور اصح ہے۔

۵۔ امام احمد بن حنبل: اسناد اور حدیث کے بارے میں یہ احسن الناس ہیں۔

۶۔ علامہ ابنِ تیمیہ : زہری نے ستر سال تک اسلام کی روایات کو محفوظ رکھا۔

۷۔ ابوزرعہ : زہری کی بیان کردہ اسناد صحیح تر ہیں۔

۸۔ الحافظ الذھبی : یہ اعلام حفاظ میں سے ہیں۔

۹۔ حافظ ابن حجر : محمد بن مسلم ..... القرشی الزہری (عالم حجاز و شام) فقیہ اور حفاظِ حدیث میں سے ہیں۔ ان کا شمار چوٹی کے ائمہ میں ہوتا ہے۔

۱۰۔ ابن الجزری : ابوبکر الزہری المدنی ائمہ کبار میں سے ہیں۔

۱۱۔ ابن العماد : زہری فقہا سبعہ میں سے ہیں۔

۱۲۔ ابن حبان : محمد بن مسلم بن شہاب الزہری نے دس صحابہ کو دیکھا۔ اپنے دَور کے بلند تر حافظِ حدیث اور فقیہ ہیں۔

۱۳۔ النووی : ان کے مرتبۂ اتقان، تثبت اور جلالت قدر کے سب معترف ہیں۔

حالات و سوانح : ان کا پورا نام محمد بن عبیداللہ بن شہاب بن عبداللہ بن الحرث ابن زہرۃ القرشی الزہری ہے۔ کنیت ابوبکر ہے۔ تاریخ ولادت میں اختلاف رونما ہے۔ اغلب یہ ہے کہ ۵۱ ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مسلم بن عبیداللہ، عبداللہ بن الزبیر کے پرجوش حامی تھے۔ چنانچہ بنی امیہ کے خلاف ان کی معرکہ آرائیوں میں برابر کے شریک رہے۔ ان کے انتقال کے وقت یہ جوان رعنا تھے۔

والد نے ان کے لیے مال و متاع کا کوئی ذخیرہ نہیں چھوڑا۔ ان کے بڑے بھائی نے جن کے بارے میں تاریخ خاموش ہے ان کی تربیت و کفالت کی ذمہ داری سنبھالی۔

سب سے پہلے ان کی توجہ حفظِ قرآن کی طرف مبذول ہوئی۔ حافظہ چوں کہ لاجواب پایا تھا، اس لیے اسّی دن میں اس کام سے فارغ ہو گئے۔ طلبِ حدیث سے پہلے عبداللہ بن ثعلب سے علم الانساب کی تحصیل کی۔ پھر صحابہ کے آخری دَور میں

مسائل حرام وحلال سے واقفیت کے شوق و داعیہ نے کروٹ لی، اور اس طرح انھوں نے عنانِ التفات کو بالآخر علم الحدیث کی طرف موڑ دیا۔ اس وقت صحابہ میں سے انس بن مالک، عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ، سہل بن سعد، ابوالطفیل، مسور بن مخرمہ وغیرہ بقیدِ حیات تھے۔ یہ ان سب سے ملے اور استفادہ کناں ہوئے۔ تابعین کبار میں جن لوگوں سے ان کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہوا، ان میں ابو ادریس الخولانی، عبداللہ، حرملۃ مولی اسامہ بن زید عبداللہ عمر کے تینوں صاحبزادے (عبداللہ، عبیداللہ اور سالم) عبدالعزیز بن مروان خارجہ بن زید بن ثابت، سلیمان بن یسار، عبداللہ بن ابی بکر بن حزم، عبداللہ بن عتبہ، عبداللہ بن الزبیر، الاعرج بن عبدالرحمٰن بن ہرمز، عطا بن ابی رباح، القاسم بن محمد بن ابی بکر، محرر بن ابی ہریرہ اور عمرۃ بنت عبدالرحمٰن کے اسما گرامی قابلِ ذکر ہیں:

امام التابعین سعید بن المسیب سے انھوں نے خصوصیت سے تلمذ کے رشتوں کو استوار کیا۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ میں نے آٹھ سال تک ان کی خدمت کی، تاکہ ان سے براہِ راست سماع حدیث کا فخر حاصل کر سکوں۔ سعید بن المسیب کی طرح مدتوں عروۃ بن الزبیر کی مجلسِ علم میں بھی حاضری دی۔ عروۃ بن الزبیر علمِ حدیث کا بحرِ بے کراں تھے۔ ان کی منزلتِ علمی کا اعتراف انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

عروۃ بحر لا ینزف۔

عروہ ایسا سمندر ہے جو پایاب ہونے والا نہیں۔

طلب حدیث کے لیے اکثر سفر پر کمر بستہ رہتے اور اس سلسلے میں عراق مصر اور شام تک ان کی تگ و تاز رہتی۔ خلفا بنو امیہ سے عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز، یزید الثانی اور ہشام بن عبدالملک کے درباروں میں اچھا خاصا اثر رسوخ رکھتے تھے۔

۱۲۴ ہجری میں بمقام 'ادامی' انتقال فرمایا اور حسب وصیت سرِ راہ دفن کیے گئے تاکہ ہر آنے جانے والا ان کے لیے دعا مغفرت کر سکے۔

اخلاق و صفات: ناٹا قد، آنکھیں قدرے آشوب زدہ، مختصر داڑھی سر اور داڑھی کے بالوں کو حنا سے رنگتے تھے۔ خوش بیان اور فصیح اللسان تھے۔ چنانچہ یہ بات مشہور تھی کہ اس دور میں تین حضرات فصحا میں شمار کیا جا سکتا ہے، طلحہ بن عبداللہ، عمر بن عبدالعزیز اور زہری۔

کرم و جود ان کا شیوہ تھا۔ لیث بن سعد کا کہنا ہے کہ میں نے جن لوگوں کو دیکھا، ان سب میں سے ان کو زیادہ سخی پایا۔ یہی وجہ ہے کوئی بھی سائل و مستحق ان کے ہاں سے مایوس ہو کر نہیں لوٹتا تھا۔ سب کی احتیاج کا خیال رکھتے تھے۔ اور اگر اپنے پاس روپیہ پیسہ نہ ہوتا، تب بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ اپنے غلام سے قرض مانگ لیتے اور حاجت مندوں کی حاجت پوری کرتے۔ مسافروں کے لیے خاص طور سے کھانا فراہم کرتے اور ثرید و شہد سے ان کی تواضع کرتے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے شکایت کی کہ ان کے ہاں اٹھارہ عمر رسیدہ عورتیں رہ رہی ہیں، جن کے پاس کوئی خادم یا ملازم نہیں جو کام کاج میں ان کی مدد کر سکے۔ آپ نے یہ سنا تو اٹھارہ ہزار دینار قرض لیے اور ان میں ہر ایک کے لیے ایک ایک خادمہ مہیا کی۔ مہمان نوازی کا یہ حال تھا کہ اصحابِ حدیث کو اکثر مدعو کرتے رہتے۔ اور اگر ان میں کسی وجہ سے دعوت قبول کرنے سے انکار کرتا تو کہتے کہ تمھاری سزا یہ ہے کہ دس دن تک متواتر تمھیں سماعِ حدیث سے محروم رکھا جائے۔

اپنے ہم عصر علما پر انھیں جو تفوق حاصل ہوا اور علم کے میدان میں جس لازوال شہرت سے بہرہ مند ہوئے اس کے دو سبب تھے:

اوّل: ان کے دل میں طلبِ حدیث کے لیے بے پناہ جذبہ موجزن تھا۔ چنانچہ حفظ و مذاکرہ حدیث کے سلسلے میں راتوں کو جاگتے، علما سے ملتے، اور ہر اس مقام تک پہنچتے جہاں حصول علم کا کوئی موقع ہو۔ ابوالزناد کا کہنا ہے کہ ہم تو

صرف انہی احادیث کو قلم بند کرتے تھے جو حلال و حرام پر مشتمل ہوں۔ لیکن یہ حضرت ان تمام علمی حقائق کو لکھ لیتے تھے، جن کو مختلف لوگوں سے سنتے۔ اور پھر جب ہمیں ضرورت محسوس ہوتی کہ ان کی علمی حقائق و نکات کے بارے میں کچھ جانیں بوجھیں تو ان سے رجوع ہوتے اور ہمیں اعتراف کرنا پڑا تا کہ ان کی ذات میں علم اپنے تمام لوازم کے ساتھ جمع ہے۔

ابراہیم بن سعد کا قول ہے کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ علم میں زہری آپ سب لوگوں سے فائق کیوں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس عادت کی بدولت کہ یہ ہر ہر علمی مجلس میں شریک ہوتے اور جوان، بوڑھا جس کو دیکھتے، اس سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ حتیٰ کہ عورتوں سے بھی پوچھ گچھ کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے۔ گھر میں بیٹھتے تو اپنے گرد و پیش کتابوں کو پھیلا لیتے، اور مطالعہ میں مصروف و منہمک ہو جاتے۔ یہ صورت حال ایسی نہ تھی کہ بیوی چپ چاپ اسے برداشت کرتی رہتی۔ ایک مرتبہ جل بھن کر کہہ ہی دیا کہ جناب آپ کی یہ کتابیں۔ میرے حق میں تین تین سوتوں سے بھی زیادہ مضرت رساں ہیں۔

مذاکرۂ حدیث کے شوق کو اس طرح پورا کرتے کہ جب رات گئے گھر لوٹتے تو لونڈی کو جگا دیتے اور کہتے سنو فلاں حدیث میں نے فلاں شیخ سے سنی اور فلاں حدیث فلاں شیخ سے۔ اس پر بھنا کر وہ کہتی۔ تو میرا ان سے کیا سروکار زہری کہتے کہ میں جانتا ہوں تم ان احادیث سے استفادہ نہیں کر سکتیں، لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اس طرح مجھے یہ احادیث یاد ہو جائیں۔

احادیثِ رسول کے پہلو بہ پہلو آثار صحابہ کو بھی یہ قید تحریر میں لانے سے گریز نہ کرتے۔ صالح بن کیسان سے مروی ہے کہ میں نے اور زہری نے ایک ساتھ تحصیل علم کا آغاز کیا۔ ہم نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ سنن کو قلم بند کیا جائے۔ چنانچہ ہم دونوں نے سنن کو قلم بند کیا۔ انھوں نے کہا کہ آثار صحابہ کو بھی ضبط تحریر میں لانا چاہیے۔ میں نے کہا، نہیں آثار صحابہ سنن کے دائرے میں نہیں آتے۔ اس لیے

ان کو رہنے دو۔ لیکن یہ ان پر مصر رہے اور آثارِ صحابہ کو بھی برابر لکھتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تو کامیاب رہے اور میرے حصے میں ناکامی آئی۔

ثانی: قوتِ حفظ اس درجہ فراوانی سے اللہ تعالیٰ نے بخشی تھی کہ ایک دفعہ جو چیز ذہن کی گرفت میں آجاتی، اس کو عمر بھر نہ بھولتے۔ ابن عساکر مورخ شام نے ان کے حافظے کی اعجوبہ کاریوں کی ایک نادر مثال بیان کی ہے۔ عبدالملک نے مدینے والوں کو دو طویل صحیفوں پہ مشتمل ایک مکتوب لکھا، جس میں ان کو بعض کوتاہیوں پر سرزنش کی گئی تھی۔ یہ خط برسرِ منبر لوگوں کو پڑھ کر سنایا گیا۔ جب لوگ فارغ ہوئے تو سعید بن المسیب کے ہاں اہلِ علم کی ایک محفل میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سعید بن المسیب نے مختلف حضرات سے پوچھا کہ ان صحیفوں میں کیا لکھا تھا۔ کوئی بھی شخص اس سوال کا صحیح جواب نہ دے سکا۔ ابنِ شہاب الزہری نے جب یہ دیکھا تو کہنے لگے کہ میں عرض کیے دیتا ہوں۔ اور پھر محض حافظہ کے بل بوتے پر اول سے لے کر آخر تک حرف بہ حرف یہ مکتوب سنا دیا۔

ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے ان کی قوتِ حفظ کا امتحان لینا چاہا۔ چنانچہ کہا کہ آپ براہِ کرم میرے بچے کو چند احادیث املا کرا دیجیے۔ آپ نے چار سو احادیث املا کرا دیں۔ ماہ ڈیڑھ ماہ کے بعد ان کو بلا کر کہا، کہ اے ابو بکر! وہ احادیث جو آپ نے لکھوائی تھیں کہیں کھو گئی ہیں۔ آپ زحمت فرما کر دوبارہ ان کو قلم بند کرا دیجیے۔ آپ نے حکم کی تعمیل کی۔ کاتب سے کہا، یہ چار سو احادیث لکھ لو۔ ہشام بن عبدالملک نے جب ان احادیث کا مقابلہ سابقہ احادیث سے کیا تو سرِ مُو فرق نہ پایا۔ یوں تو قوتِ حفظ خداداد شے ہے مگر ان کا یہ خیال تھا کہ شہد اور زبیب کھانے سے حافظہ کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

قوتِ حفظ کے ساتھ ساتھ ان کی دیانت، اتقان اور صدق کا بھی دُور دُور تک شہرہ تھا۔ جب کہیں تشریف لے جاتے، استفادہ کرنے والوں کا ایک ہجوم

ان کے گرد جمع ہو جاتا۔

امام مالک کا کہنا ہے کہ جب یہ مدینے آئے تو لوگ احادیث رسول سننے کے شوق میں ان پر ٹوٹ پڑے۔ اور ان کی موجودگی میں کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ حدیث بیان کرے۔ حالانکہ مدینے میں اس وقت ستّر اسّی مشائخ ایسے تھے جن سے طلبِ حدیث کے سلسلے میں رجوع کیا جا سکتا تھا۔

عمر بن عبدالعزیز اپنے ہم نشینوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ تم زہری سے زیادہ میل جول رکھو، کیونکہ علومِ سنت میں ان سے زیادہ جاننے والا اور کوئی نہیں۔

لیث بن سعد کا قول ہے کہ زہری نہایت جامع شخصیت کے حامل تھے۔ ترغیب کی احادیث بیان کرتے تو معلوم ہوتا کہ اس فن میں یہ یگانہ ہیں عرب و انساب پر گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا کہ کوئی دوسرا شخص ان سے بہتر اس مسئلے پر روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اور جب قرآن و حدیث کے بارے میں گوہر افشانی کرتے تو اس میں بلا کی جامعیت ہوتی۔ یہ پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے سیر پر قلم اٹھایا۔

یزید بن عبدالملک نے انھیں عہدہ قضا پیش کیا۔ ان کے بعد ہشام نے انھیں اپنے بچوں کا اتالیق و معلم قرار دیا۔

تقریباً نوے احادیث، مع اسناد جیاد کے ایسی ہیں جن میں ان کا کوئی شریک نہیں — امام مالک کا کہنا ہے کہ احادیث میں اسناد کو اول اول زہری نے اہمیت دی۔ ان کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع ہے۔ حجاز و شام کے بڑے بڑے ائمہ نے ان سے روایت کی اور ان میں جن لوگوں نے خصوصیت سے شہرت حاصل کی وہ یہ ہیں۔ عطا بن ابی رباح، ابو الزبیر المکی، عمر بن عبدالعزیز، عمرو بن دینار، صالح بن کیسان، ابان بن صالح، یحییٰ بن سعید الانصاری، یزید بن ابی حبیب، ایوب السختیانی، معمر بن راشد، ابو عمرو الاوزاعی، عبدالملک بن جریج

مالک بن انس، اللیث بن سعد، سفیان بن عنیبہ وغیرہ کتب صحاح، موطا اور مسند ایسی امہات کتب میں ان کے مرویات کو درج کیا گیا۔ یہی نہیں۔ ابواب حدیث میں بہت کم ابواب ایسے ہوں گے، جن میں ان کے مرویات باسادی کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

دیانت، صدق اور ثقاہت میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ علمی حلقوں میں ان کی رائے کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کبھی بھی کسی شخص نے حدیث و روایت کے معاملے میں ان کو متہم نہیں گردانا۔ گولڈ زیہیر وہ پہلا شخص ہے، جس نے ان کی شخصیت کو بگاڑ کر پیش کرنے کی مذموم کوشش کی۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ ان کا خلفائے بنو امیہ کے دربار میں بہ کثرت آنا جانا تھا۔ اور ان سے ان کے گہرے تعلقات اور مراسم تھے، اس لیے خلفا نے انھیں اپنی خواہشات اور آرا کی تکمیل کے لیے کھلے بندوں استعمال کیا۔

الزام کی یہ نوعیت قطعاً غلط اور مضحکہ خیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسرے تابعین کی طرح امام زہری کے بھی خلفائے بنو امیہ سے روابط تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی کب ہیں کہ یہ روابط ان کی دیانت، صدق اور منزلت علمی کو متاثر کریں، اور ان سے حق گوئی اور بے باکی کے اس جوہر کو چھین لیں، جس کو کبار تابعین کے فیضِ صحبت سے جلا ملی ہو۔ یا اس درجہ ان کو مجبور کر دیں کہ ان کی خوشنودیٔ مزاج کی خاطر یہ وضع و افترا سے کام لینے لگیں۔

"العقد الفرید" میں ہے۔ ایک مرتبہ زہری ولید بن عبدالملک کے ہاں آئے انھوں نے کہا کہ شامی علما ایک حدیث بیان کرتے ہیں اس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے۔ زہری نے پوچھا۔ امیر المومنین! کونسی حدیث۔ ولید نے یہ حدیث بیان کی:

ان اللہ اذا استرعی عبداً رعیۃ کتب لہ الحسنات و لم یکتب لہ السیئات۔

یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو اپنی رعیت کا راعی یا حکمران ٹھہراتا ہے، تو اس پر یہ کرم بھی فرماتا ہے کہ اس کی نیکیاں تو لکھی جائیں، لیکن بُرائیاں نہ لکھی جائیں۔

امام زہری نے فرمایا:

باطل یا امیر المومنین!

یا امیر المومنین! یہ باطل ہے۔

کیونکہ وہ خلیفہ جو خلعتِ نبوت سے بہرہ مند ہو، اس خلیفہ سے بہرحال اولیٰ ہے جو منصبِ نبوت پر فائز نہیں۔ اور جب وہ خلیفہ جس کو اللہ تعالیٰ نے خلافت عطا کی ہے عند اللہ اپنے اعمال کا مسئول اور ذمہ دار ہے۔ اور اس کی لغزشوں پر گرفت ہو سکتی ہے تو وہ خلفا اس ذمہ داری سے کیونکر دامن بچا سکتے ہیں جو سرے سے پیغمبر ہی نہیں ہیں۔ اس بات کے ثبوت میں امام زہری نے یہ آیت پڑھ کر سنائی:

یا داؤدُ انا جعلناك خليفةً في الارض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوىٰ فيضلك عن سبيل الله۔ (۲۶: صٓ)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کے فیصلے کیا کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمھیں خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی۔

ولید نے جب قرآن کی اس وعید پر غور کیا تو کہا۔ بلاشبہ آپ صحیح کہتے ہیں لیکن بعض لوگ ہمیں خواہ مخواہ بہکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ حقیقت کھل کر فکر و نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ خلفائے بنو امیہ کے ہاں امام زہری کا موقف ایسے شخص کا ہرگز نہ تھا، جو ان کی خوشنودیِ مزاج کا بہرحال طالب ہو، اور ان کی خواہشات کے مطابق وضع احادیث کا مرتکب ہو، بلکہ اس کے برعکس ان کا موقف ایک ایسے ناصح، مصلح اور خوددار اور بے باک

عالم حدیث کا تھا، جو برملا احکام خداوندی کو ان تک پہنچاتا ہے اور بلا خوف وخطر اہلِ ہوا و ہوس کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دُور کرتا ہے۔

امام زہری کی حق گوئی وجرأت کا ایک اور واقعہ ملاحظہ کیجیے مشہور مورخ ابن عساکر نے اسے امام شافعی کے حوالے سے بیان کیا ہے: ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے سلیمان یسار سے پوچھا، قرآن حکیم میں جو آیا ہے:

والذی تولی کبرہٗ منھم لہ عذاب عظیم ۝ (النور: ۱۱)

اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کو بڑا عذاب ہوگا۔

اس سے کون شخص مراد ہے سلیمان بن یسار نے کہا، عبداللہ بن ابی بن سلول۔ ہشام نے کہا، یہ غلط ہے۔ اتنے میں شہاب الزہری پہنچ گئے۔ ہشام نے ان سے بھی یہی سوال کیا اور انھوں نے بھی جواب میں یہی کہا کہ اس سے مقصود منافق عبداللہ بن ابی بن سلول ہے۔ اس پر ہشام نے بگڑ کر کہا:

کذبت انما ھو علی بن ابی طالب۔

تم جھوٹ بولتے ہو اس سے مراد صرف علی ابن طالب ہیں۔

زہری اس اندازِ گفتگو کی تاب نہ لاسکے۔ نہایت خشمگین لہجے میں فرمایا:

انا اکذب لا ابالک فواللہ لو نادانی مناد من السماء ان اللہ احل الکذب ما کذبت۔

لا ابالک!
کیا میں جھوٹ بولتا ہوں۔

بخدا! اگر آسمان سے میں کسی پکارنے والے کی یہ پکار سن لوں کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولنے کی اجازت مرحمت فرمادی ہے تب بھی میں جھوٹ بولنے والا نہیں۔

یہ آج سے آٹھ سو سال پہلے کی روایت ہے، جس میں امام زہری کے مرتبے ومقام کا تعین کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کے صدق مقال کا یہ حال تھا کہ اگر جھوٹ کو مباح اور جائز بھی ٹھہرا دیا جاتا تو بھی وہ اس کے ارتکاب سے

دامن کشاں رہنے کو ترجیح دیتے۔

یہاں "لا ابالک" کا محاورہ خصوصیت سے قابل غور ہے۔ اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے، جس سے برابر کے تعلقات استوار ہوں، کیونکہ اس میں ایک پہلو دشنام کا بھی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلفاء بنوامیہ سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔

کیا ایسا شخص جو اس درجہ غیور ہو کہ ایک لمحے کے لیے بھی صحابۂ رسول کی توہین برداشت نہ کر سکے اور برملا خلیفۂ وقت کی ناراضی کی پروا کیے بغیر کلمۂ حق کہہ دے، ایسی احادیث وضع کر سکتا ہے جو سراسر جھوٹ پر مبنی ہوں۔

سوال یہ ہے کہ آخر امام زہری کو خلفاء بنوامیہ کی خوشنودیٔ مزاج کے لیے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیا وہ حصولِ مال کے خواہاں تھے۔ ہرگز نہیں! خود گولڈ زہیر کو اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ ان لوگوں میں نہیں تھے، جن کو مال و دولت کی کثرت لبھا لیتی ہے۔ اس کا ثبوت عمرو بن دینار کا یہ قول ہے جس کو انھوں نے بھی نقل کیا ہے:

ما رأیت الدینار والدراهم عند احد اهون منه عند الزهری کانهما بمنزلة البعر۔

میں نے دینار و درہم کو زہری کے ہاں جس قدر کم قیمت دیکھا ہے اور کسی کے ہاں نہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی حیثیت مینگنی سے زیادہ نہیں۔

دوسرا جذبہ حبِ جاہ کا ہو سکتا ہے۔ جو کسی بھی شخص کو خوشامد و تملق پر آمادہ کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے جو ذات پوری امت اسلامیہ میں محض اپنے علم و فضل کی وجہ سے مشہور و مقبول ہو، اور جسے صدق اور سچائی کی وجہ سے بڑے بڑے ائمۂ حدیث کی صفوں میں پہلے سے ایک خاص مقام حاصل ہو، وہ بھلا غلط اور مذموم ذرائع اختیار کر کے اپنی شہرت و جاہ کو داؤں پر لگانے کا خطرہ کیوں مول لے گا۔

وضع و کذب کی اس تہمت کو پھیلانے سے پہلے گولڈ زہیر کو اس حقیقت پر

تو غور کر لینا چاہیے تھا کہ امام زہری نے تعلیم و تربیت کی منزلیں مدینہ طیبہ میں طے کیں۔ اور سعید بن المسیب ایسی شخصیت سے اخذِ فیض کیا۔ جن کی حق گوئی اور علم کا اس وقت بھی غلغلہ تھا۔ جب عبد الملک کی سطوت و جبروت کا آفتاب بامِ عروج پر تھا۔ اگر خدانخواستہ بنو امیہ سے تعلقات و معاملات کی وجہ سے یہ اس درجہ مجبور ہو گئے تھے کہ ان کی خوشنودیٔ مزاج کے پیشِ نظر احادیث گھڑیں اور کذب و افترا سے کام لیں تو سب سے پہلے ان کو اس بات پر احتجاج کرنا چاہیے تھا۔ یہی نہیں، امام مالک کو اس روش پر معترض ہونا چاہیے تھا، جن کا معمول یہ تھا، کہ جب بھی مدینہ طیبہ تشریف فرما ہوتے ان سے باقاعدہ احادیث سنتے۔ اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ بنو امیہ کے جور و ستم نے اس دور میں ایسے حالات پیدا کر رکھے تھے کہ کوئی بھی شخص ان کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، تو عباسی دور کے علما و اعلام کو کیا ہوا کہ وہ کیوں اس جرم پر خاموش رہے، اور ان کو برابر عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اور یہ بھی اگر کسی مصلحت سے چپ رہے تو امام احمد بن حنبل یحییٰ بن معین، ابن ابی حاتم اور بخاری ایسے جرح و تعدیل کے اساطین نے کیوں نہ صرف چشم پوشی سے کام لیا، بلکہ الٹا ان کی توثیق کی۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ امام زہری کی شخصیت امتِ مسلمہ میں اس درجہ بھاری بھرکم اور وقار اور تمکنت کی حامل تھی کہ کسی بھی دور میں ان کو شک و ارتیاب کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ یہ صرف گولڈ زیہر کی نگاہِ استشراق کا کرشمہ ہے کہ انھوں نے ان میں ایسے جرم کا سراغ لگا لیا، جو کسی محدث، نقاد اور مورخ کی نظروں میں نہیں کھٹکا۔

کذب و افترا کی وہ نہایت کمزور اساس جس کا سہارا گولڈ زیہر نے لیا اور اس پر شکوک و شبہات کی ایک عمارت کھڑی کر دی۔ شیعی مصنف الیعقوبی (۲۹۲ھ) کی یہ روایت ہے کہ عبد الملک نے اہلِ شام کو اس اندیشہ کے پیشِ نظر حج بیت اللہ

سے روک دیا تھا کہ مبادا جب یہ مکہ جائیں تو عبداللہ بن زبیر کے چنگل میں پھنس جائیں اور اس کی بیعت کر لیں۔ اس پر مسلمانوں میں شور برپا ہوا۔ عبدالملک نے ان کی تسکینِ خاطر کے لیے صخرہ پر قبہ تعمیر کرایا، اور کہا حج بیت اللہ کے بجائے تمھیں صخرہ کے طواف پر اکتفا کرنا چاہیے۔ لیکن صرف یہ کہہ دینا کافی نہ تھا۔ چونکہ امام زہری سے ان کی راہ و رسم تھی، اس لیے ان سے استدعا کی کہ وہ اس کی تائید میں کوئی حدیث پیش کریں۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی اور یہ حدیث پیش کی:

لَا تُشَدُّ الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد، المسجد الحرام ومسجدی ومسجد بیت المقدس۔

تم ان تین مساجد کے سوا اور کہیں سفر کر کے نہ جاؤ، مسجد حرام، میری مسجد اور مسجد بیت المقدس۔

اس افسانہ طرازی میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے۔ اس پر غور کرنے کے لیے حسب ذیل نکات پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے:

۱۔ کیا واقعی عبدالملک نے اپنے عہدِ خلافت میں لوگوں کو حج بیت اللہ سے روک دیا تھا۔

۲۔ کیا اس مشئوم غرض کی تکمیل کے لیے اس نے صخرہ پر قبہ تعمیر کرایا تھا۔ تاکہ لوگوں کی توجہ بیت اللہ کی طرف سے ہٹ جائے۔

۳۔ کیا شدِ رحال کی روایت میں زہری منفرد ہیں۔

جہاں تک پہلے مفروضہ اور بدگمانی کا تعلق ہے۔ اس کا غیر معقول، اتھلا اور بودا ہونا اس حقیقت سے واضح ہو جاتا ہے کہ حج بیت اللہ نہ صرف فرض ہے، بلکہ شعائر دین میں سے ہے اور اس سے مسلمانوں کو باز رکھنا صراحۃً کفر کے مترادف ہے۔ اس بنا پر یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی مسلمان خلیفہ اس جرم کا ارتکاب کرے۔ بالخصوص جبکہ کبار تابعین زندہ اور بقیدِ حیات ہوں اور ملتِ اسلامیہ کی غیرتِ دینی اس نوع کے کفر کی قطعی متحمل نہ ہو۔ اور پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اتنے اہم واقعہ یا حادثہ کا یعقوبی

کے سوا کوئی مورخ تذکرہ تک نہ کرے۔ الیعقوبی کے بارے میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس کا تعلق خصوم بنی امیہ سے ہے۔ یہ واقعہ یوں بھی غیر متوقع اور مستبعد ہے کہ عبدالملک ایسے متدین خلیفہ سے اس امر کی ہرگز امید نہیں کی جا سکتی کہ یہ دین کے اس استخفاف کا مرتکب ہوگا۔ اس کے مرتبہ و مقام سے متعلق یہ وضاحت کتب تاریخ و سیر میں درج ہے کہ اس کا شمار فقہائے مدینہ میں ہوتا تھا اور کثرت عبادت کی وجہ سے اسے حمامۃ المسجد کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ابوالزناد کا کہنا ہے:

کان فقہاء المدینۃ: سعید ابن المسیب وعروۃ بن الزبیر و قبیصہ بن ابی ذویب وعبدالملک بن مروان۔

طبری نے اس سلسلے میں ایک مثبت شہادت کو پیش کر کے اس الزام کی تردید کر دی ہے کہ عبدالملک نے اہلِ شام کو حج بیت اللہ سے روک دیا تھا۔ اس کا کہنا ہے۔ ۶۸ھ ہجری میں۔ عرفات میں جہاں ابن الحنفیہ، عبداللہ ابن الزبیر اور نجدۃ الحروری کے لوا و علم نصب تھے، وہاں بنوامیہ کا لوا و علم بھی نصب تھا۔

دوسرا مفروضہ بھی گولڈ زیہر کی طبع افتراپرداز کا نتیجہ ہے۔ ابن عساکر، طبری ابن الاثیر اور ابن خلدون وغیرہ اعلام مورخین نے صراحت کی ہے کہ صخرہ پر قبہ کی تعمیر کا سہرا عبدالملک کے بجائے ولید بن عبدالملک کے سر ہے۔ اگر اس واقعہ میں ذرہ بھی صداقت ہوتی کہ عبدالملک نے اسے تعمیر کرایا تھا، تو یہ مشہور مورخین اس کا ضرور ذکر کرتے۔ ہاں یہ البتہ صحیح ہے کہ دمیری نے کتاب الحیوان میں بنائے قبہ کے واقعہ کو عبدالملک کی طرف ضرور منسوب کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے دمیری مورخ کب ہیں؟ جو ان کی روایت کو اس بارے میں شائستہ اعتنا سمجھا جائے۔ مزید برآں دمیری نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ عبدالملک نے صخرہ پر قبہ اس غرض سے تعمیر کرایا تھا کہ لوگوں کو حج بیت اللہ سے روکا جائے، اور صخرہ کے احترام و اجلال پر مجبور کیا جائے، کیونکہ ایسا کرنا یہ کفر بواح کے ضمن میں آتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ

بنو امیہ کے شدید مخالفین جہاں ان کے مصائب و مظالم کا ذکر کرتے ہیں وہاں اس بہت بڑے الزام کو جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت بڑا الزام ہے نہ بیان کرتے ہیں، اور نہ حسب عادت اچھالتے اور مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ بات صحیح اور درست ہوتی تو اعدائے بنو امیہ کی نظروں سے کیونکر اوجھل رہتی۔ کیونکہ عبدالملک کا اس سے بڑھ کر اور کیا جرم ہو سکتا ہے کہ یہ تحویل قبلہ کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لیں، اور یوں کھلے بندوں شعائر دینی کی توہین و استخفاف کے مرتکب ہوں۔

تیسرے مفروضہ کو تحقیق و تفحص کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے تو گولڈ زہیر کی وسیسہ کاری پر مبنی عمارت کا ڈھانچہ دھڑام سے زمین پر آ رہتا ہے۔ اس مفروضہ کا خلاصہ یہ ہے کہ امام زہری نے خلیفہ عبدالملک کی خوشنودئ مزاج کی خاطر "شد رحال" کی حدیث گھڑی۔ حالانکہ یہ حدیث تمام کتب سنت میں منقول و مندرج ہے۔ اور زہری کے علاوہ اور طرق سے بھی مروی ہے۔ امام بخاری نے ابو سعید الخدری کے واسطے سے اسے بیان کیا ہے۔ اور امام مسلم نے ان کی روایت یوں کی ہے: جریر عن ابن عمیر عن قزعۃ عن ابی سعید۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی روایت میں زہری منفرد یا متفرد نہیں ہیں، بلکہ اس میں اور صحابہ اور تابعین بھی برابر کے شریک ہیں۔

یہ حدیث کس درجہ صحت و استواری لیے ہوئے ہے اس کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ جو زیارتِ قبور کے قائل نہیں، اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں:

ھو حدیث مستفیضٌ متلقی بالقبول اجمع اھل العلم علی صحتہ۔

یہ حدیث مستفیض ہے اور قبولیت و پذیرائی سے بہرہ ور ہے۔ تمام اہل علم نے اس کی صحت کو تسلیم کیا اور مانا ہے۔

مزید برآں اس سلسلے میں اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ امام زہری نے یہ حدیث اپنے شیخ سعید ابن المسیب کی وساطت سے پیش کی ہے جو بنو امیہ کی زیادتیوں کا شکار رہے، اور ۹۳ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سعید بن المسیب حضرت عبداللہ بن زبیر کے قتل کے بعد تقریباً بیس سال تک زندہ رہے۔ اب اگر یہ حدیث امام زہری کی گھڑنت ہوتی اور اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس سے بنو امیہ کی رضا جوئی اور حج بیت اللہ کا استخفاف مطلوب ہے تو یہ اتنا عرصہ اس پر خاموش کیوں رہے۔ حالانکہ ان کی جرأت و حق گوئی مسلمہ ہے اور اسی وجہ سے انھیں ان کے غضب و عتاب کا ہدف بننا پڑا۔

اصل بات یہ ہے کہ اس حدیث کا نہ تو کوئی تعلق بنو امیہ کی خوشنودی مزاج سے ہے اور نہ صخرہ پر قبہ کی تعمیر سے۔ یہ الگ اور مستقل بالذات ایک حکم ہے۔ جس سے مقصود امتِ مسلمہ کو شرک کے شوائب و محرکات سے باز رکھنا اور یہ بتانا ہے کہ مساجدِ ثلاثہ کی حرمت و اجلال یا فضیلت و برکت کا کیا عالم ہے یہ محض گولڈزیہر کی شرارت ہے کہ ان سے ایسے غلط معنی پہنائے اور ایسے بعید از قیاس محمل پر محمول کیا، جو مؤرخین اور شارحینِ حدیث کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔

گولڈزیہر نے حضرت امام زہری کے مرتبہ روایت و توثیق کو اہلِ علم کی نظروں میں گھٹانے اور کم کرنے کی غرض سے۔ دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ یہ بنو امیہ کے نوجوانوں کو احادیث کی روایت کی اکثر بغیر تحقیق کیے یا جانے بوجھے اجازت دے دیتے تھے، اور اس کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابراہیم بن ولید اموی ان کے ہاں ایک مجموعہ احادیث لے کر آئے اور ان سے درخواست کی، کہ اس میں مندرجہ روایات کی تحدیث کی انھیں اجازت مرحمت فرمائی جاتے۔ زہری نے بغیر کسی حیص بیص کے فوراً اجازت دے دی، اور کہا:

من یستطیع ان یخبرك بها؟

میرے سوا یہ احادیث تمھیں اور کون بتا سکتا ہے؟

اس سے اس نوجوان کو موقع ملا کہ وہ جن مرویات کو چاہے زہری کی طرف منسوب کر کے بلا محابہ بیان کر دے۔

الزام کی اس نوعیت یا بالفاظ دیگر اس افسانہ طرازی میں حقیقت اور سچائی کا پہلو کس درجہ نمایاں ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جہاں تک کتب سنت اور صحائف جرح و تعدیل کا تعلق ہے ان میں ابراہیم بن ولید کے بارے میں سرے سے کچھ مذکور ہی نہیں۔ نہ اس کا شمار ثقات میں ہوتا ہے، اور نہ ضعفاء متروکین میں، سوال یہ ہے کہ وہ صحیفہ یا مجموعہ احادیث آخر کیا ہوا، جسے امام زہری کی خدمت میں پیش کیا گیا اور کن لوگوں نے اس سے روایت کی۔ کتب تاریخ میں ان اہم سوالات کا جواب پایا نہیں جاتا۔

یہ اعتراض بھی پادر ہوا ہے کہ امام زہری بغیر تحقیق کیے اور جانے بوجھے احادیث و مرویات کے ہر اس مجموعہ پر مہر توثیق ثبت کر دیتے تھے جو ان کی خدمت میں تلامذہ اجازہ کی غرض سے پیش کرتے تھے۔ گولڈ زیہر کو کون بتائے کہ تحمل حدیث کا ایک اصول "عرض المناولہ" بھی ہے۔ اور امام زہری بلاشبہ اس پر عمل پیرا تھے۔ شیخ ابن الصلاح نے عرض المناولہ کی دو صورتیں بیان کی ہیں ایک یہ کہ استاد اپنے شاگرد کو خود کوئی کتاب یا صحیفہ عطا کرے اور اس کی روایت و تحدیث کی اجازت دے۔ دوسرے یہ کہ تلمیذ کسی اپنے صحیفہ یا کتاب کو جس کو اس نے اپنے شیخ سے سنا ہو شیخ کے سپرد کر دے اور شیخ اس کے مندرجات پر اچھی طرح غور کر کے دیکھ لے کہ آیا یہ سماع کے عین مطابق ہیں یا نہیں اور پھر اگر یہ سماع کے عین مطابق ثابت ہوں تو ان کو بیان کرنے کی اجازت دے دے۔

یہ ہے عرض المناولہ کی وہ جانی پہچانی صورت جو تمام محدثین کے ہاں عموماً مروج تھی۔ حاکم کا کہنا ہے کہ متقدمین میں ایک بہت بڑی تعداد نے اس کو سماع

کے مترادف ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ امام مالک، ربیعہ، یحیٰی بن سعید، مجاہد اور سفیان ثوری وغیرہ سے بھی تحمل وادا کا یہ معمول مروی ہے۔ ایوب کا قول ہے کہ ہم زہری کی خدمت میں توثیق و تصدیق کی غرض سے اکثر روایات پیش کرتے رہتے۔ عبید اللہ بن عمر نے فرمایا ہے۔ میں ایک مرتبہ زہری کے پاس احادیث و روایات پر مشتمل ایک کتاب لایا۔ انھوں نے اسے خوب دیکھا بھالا، اس کے بعد کہا:

اجزتك به۔

میری طرف سے تمھیں اس کی روایت کرنے کی اجازت ہے۔

گویا تحمل وادا کا یہ اسلوب ان کے ہاں بھی رائج تھا۔ ان کے اکثر تلامذہ کا کہنا ہے کہ ہم جن روایات کو ان سے سنتے تھے ان کو لکھ لیتے تھے اور پھر تصدیق و توثیق کی خاطر ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ جب انھیں ان مندرجات کے بارے میں اطمینان ہو جاتا کہ صحیح ہیں تو اجازت مرحمت فرما دیتے کہ ہم ان کو دوسروں تک بلاخوف وخطر پہنچا دیں۔

عرض المناولہ، کی اس اصطلاح پر اگر غور کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابراہیم بن ولید نے زہری کی خدمت میں اگر کوئی صحیفہ یا کتاب پیش کی ہوگی، تو اس کا مدعا اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ شیخ اس میں درج احادیث و روایات کو بنظر امعان دیکھ لیں، اور اس کے بعد اجازت سے مفتخر فرمائیں، نہ یہ کہ ایسے مفتریات کو زہری کی طرف منسوب کر کے پھیلائیں اور شائع کریں اور بایں جلالت قدر اور بایں زہد و ورع اس معصیت میں ان کے موید و معاون بنیں، اور انھیں کھلی چھٹی دے دیں کہ جو چاہیں اپنی طرف سے کہیں، اور جس حدیث کو چاہیں، بیان کریں۔ یہ بات نہ صرف امام زہری کے شایانِ شان نہیں، بلکہ اس دور کی روح کے بھی منافی ہے۔ جس میں کہ تابعین کی اکثریت ابھی بقیدِ حیات تھی، اور اسلام ایک تعامل، ایک روشنی اور اسلوبِ حیات کی حیثیت سے پورے معاشرے کی رگ و پے

میں جاری وساری تھا۔

گولڈزیہر کا تیسرا اعتراض جس کو بڑی چابکدستی اور مکاری سے ترتیب دیا گیا ہے امام زہری کے اس قول پر مبنی ہے کہ:

ان ھؤلاء الامراء اکرھونا علی کتابۃ احادیث۔

ان حکمرانوں نے ہمیں کتابتِ احادیث پر مجبور کر دیا۔

جس سے یہ مستشرق یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ بنو امیہ کے حکمرانوں اور امرا نے انھیں معاذ اللہ جھوٹ بولنے اور احادیث وضع کرنے پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔ ان کے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ پہلے ہمارا تعلق علما کے اسی گروہ سے تھا جو ازراہ تورع احادیث کو معرض تحریر میں لانے کو مناسب خیال نہیں کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ احادیث و روایات کے معاملہ میں کتابت سے زیادہ حافظہ کو اہمیت حاصل ہے، کیونکہ کتابت و تحریر میں بہرحال تغیر و تبدل اور تصحیف و تحریف کا احتمال پایا جاتا ہے، جب کہ حافظہ میں اس نوع کا احتمال پایا نہیں جاتا۔ لیکن جب عمر بن عبدالعزیز اور ہشام نے ان سے ذخیرہ احادیث کو قلمبند کرنے کو کہا۔ تو انھوں نے اس پر لبیک کہا اور اس کی افادیت کے پیش نظر احادیث و روایات کو قیدِ تحریر میں لانے پر رضامند ہو گئے۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں امام زہری نے کہا کہ ہمیں خلفا اور امرا نے مجبور کر دیا کہ وہ خزانۂ علم اور میراثِ نبوت جسے ہم اب تک سینوں میں محفوظ رکھتے چلے آتے تھے کتابت و تحریر کی شکل میں عوام تک پہنچا دیں، جب کہ اس سے پیشتر ہم صرف انھیں لوگوں کو اس کے تحمل وادا کا سزاوار قرار دیتے تھے، جو ثقہ، متقی، اور حفظ کی خداداد صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوں۔

خطیب بغدادی نے زہری ہی کے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

کنا نکرہ کتاب العلم حتی اکرھنا علیہ ھؤلاء الامراء فرأینا ان لا نمنعہ احداً من المسلمین۔

ہم علم کو قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان امرا اور حکمرانوں نے ہمیں اس پر مجبور کیا۔ چنانچہ ہم نے مناسب سمجھا کہ علم و معرفت کے ان فیوض سے کسی بھی مسلمان کو محروم نہ رکھیں۔

یعنی واقعہ صرف یہ ہے کہ امام زہری نے احادیث و روایات کی تحدیث و بیان کے بارے میں احتیاط و توسع کی اس قدیم روش کو ترک کر دیا، جس کا تعلق تعلیم و تدریس کے اس نظام سے تھا جو صرف حفظ و مذاکرہ کی استواریوں کے بل پر قائم تھا اور اس کے بجائے کتابت و تحریر کے اس اسلوب کو اپنا لینے پر مجبور ہو گئے جس سے اخذ و استفادہ کے دائرے نسبتاً زیادہ وسیع ہو جاتے ہیں۔ اور رائے کی یہ تبدیلی بقول ان کے اس بنا پر رونما ہوئی کہ امرا بنی امیہ نے تعلیم و تربیت اور اشاعت و تبلیغ سنت کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت و افادیت پر زور دیا۔

گولڈزیہر نے اس واقعہ کو جس رنگ میں پیش کیا، اس پر غور کیجیے اور بتایئے کیا بحث و استدلال کے کسی پہلو سے بھی ان کی منقولہ عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ امام زہری نے بنو امیہ کے خلفا کے ایما و حکم پر وضع و اختلاف حدیث کی طرح ڈالی۔ اور ان کی ہمنوائی اور خوشنودی کی خاطر جھوٹ بولنے کا عہد کیا۔ افترا پردازی کے اس بھونڈے انداز کو وہی شخص اپنا سکتا ہے جو یا تو اسلامی علوم اور ان کے تاریخی پس منظر سے یکسر نا آشنا ہو، اور یا پھر تعصب و عناد نے اس کے فہم و ادراک کی صلاحیتوں کو سلب کر رکھا ہو۔

ان اعتراضات کے علاوہ گولڈزیہر نے امام زہری سے متعلق کچھ اور اعتراضات بھی پیش کیے ہیں جنھیں ہم شائستہ التفات نہیں سمجھتے۔ ان سب کا حاصل بھی گھسی پٹی بات ہے جس کا وہ کئی بار اعادہ کر چکے ہیں کہ ان کا تعلق چونکہ خلفا و امرائے وقت سے نیاز مندانہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اکثر ان کے ہفوات کی تائید میں احادیث گھڑی ہیں اور وضع کی ہیں۔

ہم اس سے پہلے امام زہری کے مرتبہ عدل و اتقا اور جلالت علمی کے بارے میں ائمہ اور نقادانِ حق کی آرا نقل کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ اگرچہ خلفائے امیہ سے ان کے مراسم تھے۔ لیکن یہ مراسم نیاز مندانہ ہرگز نہ تھے اور ان سے ان کا جذبہ حق گوئی کبھی متاثر نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے انھوں نے ان کے روبرو جس بات کو صحیح سمجھا، برملا اس کا ذکر کیا اور جس کو غلط جانا بغیر کسی جھجک کے اس چیز کی تردید کی۔ اور اس بات کی قطعی پروا نہیں کی کہ اس سے اس دور کے خلفا و امرا کس درجہ چیں بہ جبیں ہوں گے۔

اور پھر مسلمان حکمرانوں سے تعلقات و مراسم کے یہ معنی کب ہیں کہ اس سے ان کا مرتبہ عدالت و ثقاہت مجروح ہوتا ہے۔ کیا متعدد صحابہ کی حضرت معاویہ سے رسم و راہ نہ تھی۔ کیا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلیفہ منصور کے ہاں آنا جانا نہ تھا اور کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ ان کے تلمیذ رشید اور منجھے ہوئے فقیہ ابو یوسف ہارون الرشید کے ایما پر مسندِ قضا پر فائز ہوتے۔ یہی نہیں تابعین میں سے بہت سے نامور اصحاب نے بنو امیہ کے عہد میں عہدۂ قضا کو زینت بخشی۔ جیسے شریح، ابو ادریس الخولانی۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور قاسم بن عبدالرحمٰن بن مسعود وغیرہ۔

لیکن اس کے باوجود امتِ مسلمہ میں کسی شخص نے ان حضرات کی جلالت قدر اور مرتبہ اتقا و ثقاہت کو ہدفِ مطاعن نہیں ٹھہرایا۔

کتبِ حدیث اور ان کے مؤلفین

احادیثِ رسول کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو کر لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ امام احمد بن حنبل نے سات لاکھ پچاس ہزار روایات میں سے قریباً چالیس ہزار کو منتخب کیا اور ان سے اپنی معروف کتاب مسند کو زینت بخشی۔ سیوطی نے "جمع الجوامع" میں کوشش کی کہ آنحضرت کی تمام احادیث کا استیعاب کیا جائے۔ لیکن ابھی ایک ہی لاکھ کے قریب احادیث ترتیب دے پاتے تھے کہ فرشتۂ اجل نے زندگی کا رشتہ منقطع کر دیا۔

ظاہر ہے اتنے بڑے خزانۂ علم کو جو متعدد اور بوقلموں کتب مدوّنہ میں محفوظ ہے اور جس کی ترتیب و تسوید میں مختلف زمانوں میں مختلف محدثین نے حصہ لیا ہے۔ صحت و استواری کے لحاظ سے ایک ہی مرتبہ، درجہ کا قرار نہیں دیا جا سکتا — اس لیے علما اور نقادانِ فن نے ان تمام مجموعوں کو مندرجہ ذیل چار طبقات میں تقسیم کیا ہے:

طبقۂ اولیٰ: اس میں موطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم داخل ہیں۔

طبقۂ ثانیہ: اس میں جامع الترمذی، سنن ابی داؤد، ابن ماجہ، مسند احمد، نسائی کا نام آتا ہے۔

طبقۂ ثالثہ: اس میں جو کتب شامل ہیں وہ یہ ہیں: مسند ابن ابی شیبہ، مسند الطیالسی، مسند عبد بن حمید، مصنف عبدالرزاق اور کتب بیہقی، طبرانی اور طحاوی۔

طبقۂ رابعہ: یہ ان لوگوں کی غیر مستند کوششوں سے تعبیر ہے۔ عصورِ متاخرہ میں جنھوں نے قصہ گو، واعظین، صوفیہ اور اصحاب بدع اور اہوا سے موضوع و

ضعیف احادیث نقل کر کے اپنی تصنیفات کو سجایا۔ جیسے ابن مردویہ، ابن شاہین
و رابی الشیخ وغیرہ۔

ہم آئندہ سطور میں صرف طبقہ اولیٰ اور ثانیہ سے متعلق چند کتابوں اور ان کے مولفین کا تذکرہ کریں گے۔ کیونکہ یہی وہ علمی و تہذیبی ورثہ ہے جس پر بغیر کسی اختلاف رائے کے عمل، استدلال اور فقہ و تقنین کا عموماً مدار رہا ہے۔

ان کتابوں کے مؤلفین فنِ حدیث کے امام و نقاد ہیں۔ ان کی تالیفات نہ صرف جودت اسناد اور صحت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونے کی وجہ سے امتیاز کی درجہ کی سزاوار ہیں، بلکہ ان کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کو جو حلقہ محدثین میں لازوال شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی، یہ انہی کا حصہ و مقدر رہے

مؤطا: اس کے لغوی معنی ایسی راہ کے ہیں جو پامال اور عام ہو جس پر کثرت سے لوگ چلے اور گزرے ہوں۔ اور مجازی معنی یہ ہیں کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں زندگی کے اس اسلوب و نہج کی تفسیر بیان کی گئی ہے جس کو آنحضرتؐ نے اختیار کیا، جس کو صحابہ نے اپنایا اور علماء و محدثین نے استدلال و رائے کا ماخذ و مبنی قرار دیا۔ یہ امام مالک کی وہ مایہ ناز اور لائق صد افتخار تالیف ہے جس نے صحابہ کے عمل، فتاویٰ اور سنن کی تفصیلات کو آنحضرتؐ سے قریب ترین عہد میں پیش کیا۔
امام شافعی کا کہنا ہے:

ما اعلم شیئًا اصح من مؤطا۔

مؤطا سے زیادہ صحیح کتاب میرے علم میں نہیں آئی۔

قاضی ابو بکر "القبس" میں لکھتے ہیں:

ھذا اول کتاب الف فی شرائع الاسلام۔

شرائع اسلام کے بارے میں یہ پہلی کتاب ہے جو تالیف ہوئی۔

قاضی عیاض نے ایک نظم میں اسے احادیث کے اعتبار سے اصح، اور استدلال و استنباط کے لحاظ سے اثبت کہا ہے۔

حضرت سفیان کا قول ہے:

اول من صنف الصحیح مالک والفضل للمتقدم۔

مالک پہلے محدث ہیں جنہوں نے صحیح تالیف کی اور فضیلت کا حق دار متقدم ہی ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ کا ارشاد ہے کہ مؤطا صحیحین کے لیے بمنزلہ ماں کے ہے۔ کیونکہ امام بخاری و مسلم نے اسی سے طریق روایت تمیز رجال اور وجود استنباط کا علم سیکھا ہے۔

ابوزرعہ رازی نے کہا ہے۔ اگر کوئی شخص حلفیہ یہ کہے کہ مؤطا کی احادیث اگر صحیح نہ ہوں تو میری بیوی پر طلاق واقع ہو۔ اس صورت میں یہ حانث نہیں ہوگا مؤطا ابتداً دس ہزار احادیث روایات پر مشتمل تھی جن میں آثار، فتاویٰ اور مرسل و موقوف سب نوع کی روایات پائی جاتی تھیں لیکن تحقیق و تفحص کے بعد امام نے ۱۷۲۰ احادیث کو اس لائق سمجھا کہ مؤطا میں جگہ پائیں۔

درجہ اولیٰ کی کتابوں میں اس کا کیا مقام ہے؟ اس میں دو رائیں ہیں۔ متقدمین میں کچھ حضرات نے اس کو صحیح بخاری اور مسلم سے فائق جانا ہے متاخرین میں شاہ ولی اور شاہ عبدالعزیزؒ اس کو صحیح بخاری اور مسلم پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن نقادانِ فن اور جمہور علما کے نزدیک صحیحین کثرت روایت، جودتِ رجال اور حسن ترتیب وغیرہ کے اعتبار سے مؤطا سے افضل ہیں۔

مؤطا کو صرف حدیث و فقہ کے زر و جواہر پر مشتمل ایک گنجینہ سمجھنا غلط ہے۔ یہ ہماری تہذیب و ثقافت کی اولیں، مستند تر اور مکمل دستاویز ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ اس میں جہاں احادیث کو جمع کیا گیا ہے وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عہدِ صحابہ میں زندگی کا چلن کیسا تھا اور اسلام کے مرکز ثانی مدینہ میں جو مبدا وحی اور مرکز انوارِ نبوت ہے اسلام کو کس رنگ میں پیش کیا گیا، کس طرح سمجھا گیا اور اس کے احکام و مسائل کی وہ کیا فقہی شکل تھی جو صحابہ نے اپنائی۔ یعنی یہ دستاویز

اس تاریخی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کا تعلق عہدِ نبوی سے بہت قرب کا ہے۔ اس میں چالیس روایات ایسی ہیں جن میں امام صاحب اور آنحضرتؐ کے درمیان صرف دو راویوں کا واسطہ ہے۔ ان روایات کو اصطلاح محدثین میں ثنایات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ابوالقاسم بن محمد بن حسین شافعی کا کہنا ہے کہ مؤطا کے متعدد نسخے ہیں ان میں گیارہ زیادہ معروف ہیں، لیکن چار ایسے ہیں جو قبولیت و شہرت کے بامِ عروج پر پہنچے۔ موطا یحییٰ بن یحییٰ المصمودی، موطا ابن بکیر، مؤطا ابی مصعب اور موطا ابن وہب۔ لیکن جب مطلقاً موطا کا نام لیا جاتا ہے تو اس سے مراد یحییٰ بن یحییٰ کی روایت ہی ہوتی ہے۔

یحییٰ بن یحییٰ المصمودی، اندلسی ہیں اور امام صاحب کے ان تلامذہ میں ہیں جن کا امام صاحب بہت احترام کرتے تھے۔ خود اندلس میں انھیں عزت و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ صاحب کشف الظنون نے مؤطا کی متعدد شروح کا تذکرہ کیا ہے مشہور شارحین کے نام یہ ہیں:

ابو محمد عبداللہ بن محمد النحوی البطلیموسی، ابو مروان عبدالملک بن حبیب المالکی شیخ جلال الدین السیوطی۔ الحافظ ابو عمر بن عبدالبر یوسف بن عبداللہ القرطبی۔ متاخرین میں شاہ ولی اللہ کی شروح المصفیٰ اور المسوّیٰ ہیں جو عربی اور فارسی میں لکھی گئیں۔

امام مالک.... مؤطا کے مؤلف کا اسم گرامی مالک ہے، ابو عبداللہ کنیت ہے۔ اور امام دارالہجرۃ لقب۔ سلسلہ نسب یوں ہے: ابو عبداللہ مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن الحارث بن غیمان ابن جثیل (ابن سعد نے خثیل لکھا ہے) بن عمرو بن اصبح۔

آپ کے پردادا ابو عامر آنحضرتؐ کے عہدِ سعادت میں حیات تھے ایک روایت کے مطابق۔ بدر کے سوا تمام معرکہ آرائیوں میں آنحضرتؐ کے ساتھ

شریک رہے ہیں۔ ذہبی نے تجرید الصحابہ میں ان کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ اگرچہ آنحضرتؐ کے زمانے میں اسلام کی آغوش میں آچکے تھے لیکن ان کا آنحضرتؐ سے لقا ثابت نہیں۔ یحیی بن بکیر کی روایت کے مطابق مدینہ منورہ میں ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ شکل وصورت کا انداز یوں تھا۔ فربہ اندام، رنگ زردی مائل سفید، چشم کشادہ، صورت حسین، ناک شرفا عرب کی طرح بلند۔

نہایت خوش لباس تھے، کپڑے خاص اہتمام سے مصر وخراسان سے منگواتے۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے تو فرماتے علمائے مدینہ کا یہی دستور ہے۔ خوشبو کا استعمال اکثر کرتے۔ مجلسِ درس میں عود کی انگیٹھی سلگتی رہتی۔ جس فضا سے ایک بار گزر جاتے مہک دیر تک اس پر چھائی رہتی۔

ہمیشہ باوقار علما کی ہم نشینی اختیار کی اور شب وروز مطالعہ وتدریس میں مصروف رہتے۔ کہا کرتے تھے کہ میں نے سفہا اور کم عقل لوگوں کی رفاقت وصحبت کبھی پسند نہیں کی۔

مدینہ طیبہ سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ سفرِ حج کے سوا کبھی مدینہ سے باہر قدم نہیں دھرا۔ فیاض، حق گو اور بلا کے مستقل مزاج تھے۔ ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔

آپ کے شیوخ جن سے آپ نے حدیث سیکھی۔ نافع، زہری، امام جعفر صادق، محمد بن المنکدر، محمد بن یحییٰ، ابو حازم اور ابو سعید ایسے مشاہیر ہیں۔ جن کے صدق، تثبت اور حفظ واتقان پر امت کا اتفاق ہے۔

نافع حضرت عبداللہ بن عمر کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ۳۰ برس تک برابر حضرت عبداللہ بن عمر کی جلوت وخلوت میں شریک رہے۔ جب تک یہ بقیدِ حیات رہے امام مالک ان کے حلقۂ درس سے استفادہ کناں رہے۔

زہری کا حدیث وسنت کے حلقوں میں کیا مقام ہے اس پر ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

امام جعفر صادق، امام باقر کے نامور فرزند ہیں۔ ان کے تلامذہ میں امام مالک کے علاوہ سفیان بن عینیہ، سفیان ثوری اور امام ابو حنیفہ ایسی عظیم شخصیتیں داخل ہیں۔

محمد بن المنکدر کبار تابعین میں تھے۔ صدق و راست گوئی میں مشہور تھے زہری، شعبہ اور سفیان کے شیخ حدیث تھے۔

محمد بن یحییٰ انصاری۔ امام لیث بن اسحاق اس کے شاگرد ہیں۔

ابو حازم: تابعی تھے۔ حضرت سہل بن سعد سے لقاء و روایت کا شرف حاصل تھا۔ مدینہ کے مفتی تھے۔ نسائی اور ابن معین نے ان کی توثیق فرمائی ہے۔

ابو سعید! مدینہ طیبہ میں عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ عدی بن ثابت اور زین العابدین کے شاگرد تھے۔ امام مالک کے علاوہ شعبہ، ثوری، ابن عینیہ، حماد بن زید اور لیث وغیرہ نے ان سے روایت کی۔

صحیح بخاری: اس عظیم المرتبت، آئینۂ انوارِ رسالت اور صحت و وثوق میں فائق تر کتاب کا پورا نام: "المسند الجامع الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ" یہ پہلی کتاب ہے جس میں احادیث کے وسیع تر ذخیرہ میں سے صرف انہی احادیث سے اعتنا کیا گیا ہے جو سند و متن کے اعتبار سے صحت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔ علامہ نووی کا کہنا ہے:

اتفق العلماء علی ان اصح الکتب بعد القرآن الکریم الصحیحان صحیح البخاری وصحیح مسلم وتلقّٰھا الامۃ بالقبول وکتاب البخاری اصحھما صحیحًا۔

فنِ حدیث کے جاننے والوں کا اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ قرآن کریم کے بعد کتبِ حدیث میں سے صحیحین یعنی بخاری و مسلم صحت و وثوق کے بلند ترین درجے پر متمکن ہیں۔ آئمہ حدیث کے حلقوں میں ان دونوں کو زبردست قبول و پذیرائی حاصل ہے لیکن صحیح بخاری نسبتاً زیادہ صحت و قوت کی حامل ہے۔

امام مسلم کا قول ہے:

لیس لہ نظیر فی فن الحدیث۔

فن حدیث میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔

ذہبی نے کہا ہے:

اما الجامع البخاری فاجل کتب الاسلام وافضلہا بعد کتاب اللہ۔

صحیح بخاری کتب اسلام میں کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر اور اچھی ہے۔

امام نسائی کا قول ہے:

اجود ھذہ الکتب کتب البخاری۔

کتب حدیث میں صحیح بخاری جودت و صحت میں ممیز ہے۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر نے ان الفاظ سے خراج تحسین پیش کیا ہے:

لیستسقی بقرأتہ الغمام واجمع علی قبولہ وصحۃ ما فیہ اھل الاسلام۔

ابر و سحاب اس سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور اہلِ اسلام کا اس کی صحت و پذیرائی پر مکمل اتفاق ہے۔

البرہان القیراطی اور علامہ علاء الدین دمشقی نے اس کی تعریف میں باقاعدہ قصیدے لکھے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ صحیح بخاری نے کن فضائل اور خوبیوں کی وجہ سے قبول عام اور بقائے دوام کا مقام حاصل کیا ہے۔

بعض مغاربہ بخاری و مسلم کے باہمی تقابل سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر فضیلت و برتری حاصل ہے لیکن یہ تقابل نسبی اور اضافی ہے اس کا تعلق صحیح مسلم کے حسنِ بیان، جودت وضع اور رعایت دقائق الاشارات سے ہے۔ صحت و قوت، نقد و تفحص اور حکمت و فقہ کے ان

جواہر ریزوں سے نہیں جو صحیح بخاری کے صفحات و ابواب میں پھیلے ہیں۔
اس حقیقت کو حافظ عبدالرحمٰن بن علی بن ربیع نے ایک نظم میں یوں بیان کیا ہے:

تنازع قوم فی البخاری و مسلم　　لدی وقالوا ای ذین یقدم

فقلت لقد فاق البخاری صحۃ　　کما فاق فی حسن الصناعۃ مسلم

یعنی میرے ہاں کچھ لوگوں نے اس مسئلہ میں بحث و تکرار سے کام لیا کہ صحیح بخاری و مسلم میں کون تقدم و فوقیت کی حقدار ہے، میرا جواب یہ تھا کہ جہاں تک صحت و قوت اسناد کا تعلق ہے صحیح بخاری کو اسی طرح تقدم حاصل ہے جس طرح کہ صحیح مسلم حسن صناعت و ترتیب کے لحاظ سے تقدم و فوقیت کی سزاوار ہے۔ صحیح بخاری کو جو امت نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہمہ گیر قبولیت و پذیرائی سے نوازا اس کے اسباب یہ تھے کہ:

۱۔ اس کے دامن میں تمام مسانید و صحاح کا مستند ترین ذخیرہ سمٹ آیا ہے۔

۲۔ اس کی شرائط اندراج نسبتاً کڑی اور سخت ہیں۔ یہی وجہ ہے امام بخاری نے کسی روایت کو اس وقت تک اپنی صحیح میں رقم نہیں فرمایا جب تک اس بات کا یقین نہیں کر لیا کہ راوی کو مروی عنہ سے لقا و تعلم کا شرف حاصل ہے۔ صرف معاصرت کا ان کے ہاں اعتبار نہیں۔

۳۔ صحت و قوت کے التزام کے ساتھ امام نے صحیح بخاری کے ابواب و تراجم میں جن فوائد فقہیہ، نوادر حکمیہ اور دقائق استدلال و استنباط کا اظہار کیا ہے یہ انہی کا حصہ اور مقدر ہے اس میں کوئی دوسرا شریک و سہیم نہیں۔ اسی حقیقت کو علما حدیث نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: فقہ البخاری فی تراجمہ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام بخاری کے فقہی اور حکیمانہ مقام کو جاننے کا شوق ہو تو صحیح بخاری کے تراجم پر غور کرو۔

۴۔ بخاری کے جن رجال رواۃ کو نقادانِ فنِ حدیث نے جرح و گفتگو کا ہدف ٹھہرایا۔ وہ صحیح مسلم کے رجال کے مقابلہ میں کہیں کم ہیں۔

۵۔ اس میں مضامین کے اعتبار سے تنوع اور جامعیت پائی جاتی ہے۔ یعنی جہاں اس میں احادیثِ رسول کو بیان کیا گیا ہے وہاں آثارِ صحابہ، غریب القرآن اور ارباب سیر کے طریق پر خصوصیات احوال و وقائع پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

امام بخاری کے دل میں اس بلند پایہ تالیف کا خیال کیونکر پیدا ہوا اس کو انھوں نے خود بیان کیا ہے:

کنت عند اسحٰق بن راھویہ فقال لی بعض اصحابہ لو جمع احدٌ کتابا مختصراً فی سنن الصحیحۃ عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ التی بلغت من الصحۃ اقصی درجا تھا کان احسن وتیسر العمل علیھا للعاملین من دون مراجعۃ الی المجتھدین قال فوقع ذٰلک فی قلبی۔ واخذ بمجامع خاطری فصنفت ھذا الجامع الصحیح

میں اپنے استاد اسحٰق بن راہویہ کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کے تلامذہ میں ایک صاحب نے یا بروایت دیگر خود انھوں نے کہا۔ اگر کوئی شخص آنحضرتؐ کے سنن کے بارے میں ایک مختصر مگر صحیح تر کتاب ترتیب دے دے تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ عمل کرنے والوں کے لیے اس میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ وہ بغیر فقہا مجتہدین کی منت پذیری کے حقیقت حال کو جان سکیں گے۔ میں نے جب یہ تجویز سنی تو دل کو ایسی بھائی، کہ اس کے نتیجے میں میں نے اس جامع اور صحیح کتاب کو مرتب کر ڈالا۔

علامہ ابن حجر نے اس میں مندرج احادیث کی تعداد ۷۳۹۷ بتائی ہے۔

امام ہمام نے جب اپنی اس معرکۃ الآرا تصنیف کو امام احمد، ابن معین اور ابن المدینی ایسے جہاندہ فن کے روبرو پیش کیا تو انھوں نے اس کی توثیق کی اور اتنے بڑے ذخیرۂ حدیث میں چار ایسی احادیث کی نشاندہی کی جو ان کے نقطۂ نظر سے صحت

کے اعلیٰ معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں اور ان چار حدیثوں کے بارے میں بھی عقیلی کی یہ رائے ہے کہ شرائط صحت کے عین مطابق ہیں۔

القول فیھا قول البخاری۔

اس سے متعلق، امام بخاری کا قول ہی راجح قول ہے۔

یوں تو صحیح بخاری کے سماع سے بہرہ مند ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے لیکن وہ جلیل القدر رواۃ جن کے ذریعے اس کی اشاعت کے دائرے وسیع ہوئے یہ ہیں:

ابو طلحہ منصور بن علی بن قرنیہ البزودی، القاضی حسین بن اسمٰعیل المحاملی، ابراہیم بن معقل النسفی اور الفربری۔

موخر الذکر الفربری کے نسخہ نے قبول عام اور شہرت دوام حاصل کی۔

صحیح بخاری اپنے دامنِ علم میں کس درجہ وسعتیں لیے ہوئے ہے اور فقہاء محدثین کے حلقوں میں اس کی قبولیت و پذیرائی کا کیا عالم ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بقول صاحب کشف الظنون کے ۸۲ ائمہ فن نے اس کی شرح رقم فرمائیں، جن میں زیادہ اہم چار ہیں:

فتح الباری (ابن حجر)۔ التنقیح (بدرالدین زرکشی)۔ عمدۃ القاری (علامہ عینی) التوشیح (جلال الدین السیوطی) فتح الباری اور عمدۃ القاری کے مؤلفین ہم عصر ہیں۔ دونوں نے اپنے ذوق و مشرب کے مطابق صحیح بخاری کے مندرجات کی تشریح کی ہے۔ علامہ ابن حجر نے اگر بطریق محدثین، رجال، لغت اور تطبیق احادیث و آثار میں تحقیق و کاوش کے شاہکار پیش کیے ہیں۔ تو علامہ عینی نے بھی ان پہلوؤں کے علاوہ فقہی مسائل سے اس دقیقہ سنجی اور عمق و گیرائی سے تعرض کیا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔

امام بخاری! صحیح بخاری کے مؤلف شہیر کا شجرہ نسب یوں ہے۔ ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن المغیرہ بن الاحنف الجعفی۔

جمعہ کے روز عشا کے بعد بخارا میں ۳ شوال ۱۹۴ھ کو تولد فرمایا۔ قد و قامت میں توازن و اعتدال کارفرما تھا۔ یعنی نہ زیادہ طویل تھے اور نہ زیادہ کوتاہ۔ متعدد القاب کے ساتھ یاد کیے جاتے تھے۔ جیسے امیر المومنین فی الحدیث، ناصر الاحادیث المصطفویہ اور ناشر المواریث المحمدیہ۔

امام مسلم جو ان کے معاصر اور تلمذ اور جلیل القدر محدث تھے۔ انھیں طبیب الاحادیث، استاذ الاستاذین اور سید المحدثین کہہ کر پکارتے تھے اور اکثر فرطِ عقیدت سے کہتے تھے: اجازت دیجیے کہ میں آپ کے پاؤں پر بوسۂ توقیر ثبت کروں۔

ابن المدینی کا کہنا ہے کہ خود امام بخاری کی نظروں میں کوئی دوسرا شخص ان کے پایہ کا نہیں تھا۔

حافظ ابن خزیمہ کا قول ہے کہ اس آسمان نیلگوں کے نیچے کوئی بھی شخص ان کی طرح حدیث کے فہم و حفظ پر قادر نہیں۔

ان کے اجداد میں مغیرہ پہلے شخص تھے جن کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ مجوسیت سے توبہ کر کے والی بخاری یمان جعفی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ جعفی انھیں اسی رعایت کی بنا پر کہا جاتا ہے۔

امام بخاری نے جن گرامی قدر راشدین کی آغوش میں پرورش پائی، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نہ صرف زہد و ورع کے مرتبہ علیا پر فائز تھے، بلکہ علمِ حدیث سے بھی اچھی طرح بہرہ ور تھے۔ ان کے والد نے امام مالک اور ان کے طبقے کے محدثین سے روایت کی۔

ان کے شیوخ کی فہرست میں وہ حضرات داخل ہیں جن کا تعلق تبع تابعین اتباع تبع تابعین معاصرین اور اقران سے ہے۔ مزید برآں انھوں نے اپنے تلامذہ سے بھی روایت کرنے میں عار نہیں سمجھا۔ کیونکہ بقول ان کے محدث کے لیے ضروری ہے کہ بغیر کسی فرق و امتیاز کے ہر اس شخص سے استفادہ کرے جو سنن اور

احادیث سے ایک گونہ واقفیت رکھتا ہو:

لا یکون کاملاً حتیٰ یکتب عمن فوقہ وعمن مثلہ وعمن دونہ۔

محدث اس وقت تک ذروہ کمال تک نہیں پہنچتا۔ جب تک سب سے روایت نہ کرے۔ اس شخص سے بھی جو علم میں اس سے فائق ہے۔ اس شخص سے بھی جو رتبہ میں اس کے برابر ہے اور اس سے بھی جو اس سے کم درجہ کا ہے۔

انھوں نے جب شعور کی آنکھ کھولی، تو اپنے گرد وپیش اسلامی علوم وفنون کا ایک دریا موجزن پایا۔ ان سے پہلے امام مالک اور سفیان ثوری حدیث فقہ اور مسائل پر کافی روشنی ڈال چکے تھے۔ ابن جریج تفسیر پر کھل کر طبع آزمائی کر چکے تھے۔ ابوعبید کی غریب القرآن پر پرمغز کاوشیں پھیل چکی تھیں۔ سیر و تاریخ میں محمد بن اسحاق اور موسیٰ بن عقبہ کی تفصیلی کوششیں بار آور ہو چکی تھیں عبداللہ بن مبارک زہد و ورع پر بہت کچھ بیان کر چکے تھے۔ کسائی آغاز آفرینش اور قصص الانبیا کے بارے میں اظہار خیال کر چکے تھے۔ یحییٰ بن معین صحابہ و تابعین کے احوال سے متعلق بہت کچھ کہہ چکے تھے۔ اس کے علاوہ مبتدعین جیسے جہمیہ وغیرہ کے خیالات و افکار بھی اسلامی معاشرہ میں بعض لوگوں میں فکری و ذہنی انتشار کا باعث بن چکے تھے۔

امام موصوف نے ان تمام علوم و معارف اور خیالات سے استفادہ کیا اور اپنی صحیح میں تراجم کی صورت میں تردیداً یا اشارتاً ان کو سمو لیا۔ ان کا طلب حدیث میں خاص اسلوب یہ تھا کہ بلادِ اسلامی میں خود گھوم پھر کر یہ دیکھتے کہ احادیثِ رسول کس کس کے سینے میں محفوظ ہیں۔ محدثین کے پاس سفر اختیار کر کے جاتے۔ دیکھتے، اچھی طرح جانچتے پرکھتے اور پورا پورا اطمینان کر لینے کے بعد ان میں سے بعض سے روایت کرتے۔ ان کا کہنا ہے حدیث کی تلاش و جستجو میں میں شام، مصر اور الجزیرہ دو مرتبہ گیا۔ بصرہ میں چار مرتبہ قیام کا موقع ملا۔ حجاز میں پورے چھ سال بسر کیے۔

اور بغداد و کوفہ کے کتنے پھیرے ہوئے ان کا شمار مشکل ہے۔

حفظ و مذاکرہ کی صلاحیتوں کا کیا عالم تھا، اس کو ان کے ایک معاصر حامد بن اسمٰعیل کی زبانی سنیے:

ان کا کہنا ہے امام بخاری کا میرے ساتھ اکثر محدثین کی مجالس میں آنا جانا رہتا تھا، لیکن اس شان کے ساتھ کہ نہ ہاتھ میں قلم ہے نہ دوات و قرطاس۔ میں ان سے کہتا رہتا کہ آپ کو آمد و رفت سے کیا فائدہ پہنچتا ہے جب کہ آپ ان احادیث کو جو شیوخ بیان کرتے ہیں، قیدِ تحریر میں نہیں لا پاتے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا، میں تیرا یہ طعن سنتے سنتے بھنا گیا ہوں۔ آؤ! آج یہ دیکھ لیں کہ میں نے جن احادیث کو حفظ کیا ہے، ان میں اور وہ احادیث جن کو تم نے باقاعدہ لکھ رکھا ہے کیا فرق ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ہم دونو نے مقابلہ کیا تو ان کے مجموعۂ احادیث کو جو ہزاروں روایات پر مشتمل تھا، اس درجہ صحیح تر پایا کہ مجھے اس کی روشنی میں اپنے تحریر شدہ مسودہ کی اصلاح کرنا پڑی۔

علامہ سبکی نے طبقات کبریٰ میں ان کے ذوقِ شعری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے لیکن غالباً یہ صحیح نہیں مسلمانوں میں زہد و ورع کے پہلو بہ پہلو اخلاقیات میں جود و سخاوت اور مروّت و پاک بازی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اور امام بخاری کو ان دونوں اوصاف میں بہرہ وافر حاصل تھا۔ باپ سے جو ترکہ ملا اس کو مہمان نوازی اور طلبہ حدیث کی ضروریات پر صرف کیا۔ مروّت و پاکبازی کا یہ حال تھا۔ کبھی بھی کسی شخص کی غیبت کے مرتکب نہیں ہوئے۔

صحیح بخاری کے علاوہ ان کی اور بھی تصنیفات ہیں جیسے الادب المفرد۔ قراءت الامام، بر الوالدین، کتاب الھبۃ، کتاب الوحدان، کتاب العلل کتاب الکنیٰ اور تاریخ اوسط و تاریخ صغیر وغیرہ۔

۲۵۶ھ میں سمرقند کے ایک قریہ خرتنگ میں وفات پائی۔

ایک شاعر نے ان کی تاریخ ولادت و وفات اور سنین حیات کی ان اشعار

میں نشاندہی کی ہے۔

کان البخاری حافظا ومحدثا   جمع الصحیح مکمل التحریر

میلادہ صدق ومدتہ عمرہ   فیھا حمید وانقضی فی نور

صحیح مسلم! صحاح ستہ میں صحیح بخاری کے بعد دوسرے درجے پر جس کتاب کو امت کے تمام حلقوں میں بہت زیادہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا اور جس کی صحت و استناد کا پورے عالم اسلامی میں چرچا ہوا، وہ صحیح مسلم ہے۔ اس میں بحذف مکررات چار ہزار احادیث مندرج ہیں۔ کل تعداد جن میں مکررات بھی داخل ہیں سات ہزار دو سو پچھتر کے لگ بھگ ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ بعض علما مغرب اس کے اسلوب اور حسن صناعت سے اس درجہ متاثر ہیں کہ ان کی رائے میں اس کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے۔ حافظ ابو علی نیسا پوری بھی جو حاکم کے شیوخ میں ہیں۔ اس کے بارے میں ان کے ہم نوا ہیں، ان کا قول ہے:

ما تحت ادیم السماء اصح من کتاب مسلم۔

اس آسمان کے نیچے صحیح مسلم سے زیادہ صحیح اور کوئی کتاب نہیں پائی جاتی۔

صحیح مسلم کی یہ فوقیت سراسر نسبی اور اضافی ہے۔ اس کا مابہ الامتیاز دراصل یہ امر ہے کہ اس کے مولف احادیث کو مفاطیع کی حیثیت سے امام بخاری کی طرح ابواب میں نہیں پھیلاتے، بلکہ ایک ہی باب میں تمام متعلقہ احادیث جمع کر دیتے ہیں۔

اس میں رباعیات یعنی ایسی احادیث بھی ہیں، جن میں راوی اور آنحضرت کے درمیان صرف چار ہی رواۃ کا واسطہ ہے۔

احادیث کے اندراج میں انھوں نے کن شرائط کو ملحوظ و مرعی رکھا ہے۔ ابن الصلاح نے اس کی ان الفاظ میں تصریح کی ہے:

شرط مسلم فی صحیحہ ان یکون الحدیث متصل الاسناد بنقل الثقۃ عن الثقہ سالما من الشذوذ والعلۃ۔

مسلم نے اپنی صحیح میں اس بات کا التزام کیا ہے کہ حدیث سند کے اعتبار سے اس طریق سے موصول و متصل ہو کہ ثقہ ثقہ سے روایت کرے اور یہ کہ یہ شذوذ و علّت کے عیوب سے ہر طرح پاک ہو۔

امام مسلم نے اس جلیل القدر کتاب کی تالیف اور خصوصیات سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

ما وضعت شيئاً في كتابي هذا الا بحجة وما اسقطت منه شيئاً الا بحجة۔

میں نے اس میں جن روایات کا اندراج کیا ہے وہ بھی دلیل کی بنا پر کیا ہے اور جن روایات کو درج نہیں کیا، وہ بھی بر بنائے دلیل نہیں کیا۔

ليس كل شئ عندي صحيح وضعته ههنا۔ انما وضعت ما اجمعوا عليه۔

میں نے اس میں ہر اس حدیث کو درج نہیں کیا جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں بلکہ صرف انہی احادیث کو درج کیا ہے جن کی صحت پر اجماع ہے۔

عرضت كتابي هذا على ابي زرعة الرازي۔ فكلما اشار انه له علة تركته، و كلما قال انه صحيح وليس له علة خرجته۔

میں نے اپنی یہ تالیف مشہور محدث ابوزرعہ رازی کو دکھائی۔ سو جہاں جہاں انھوں نے علّت کی نشاندہی کی میں نے ان کو ترک کر دیا، اور جس جس حدیث کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے اور علت سے پاک ہے، میں نے اس کی تخریج کی۔

علمی دنیا میں اس کی پذیرائی و قبولیت کے دائرے کتنے وسیع ہیں اور اس میں مذکورہ احادیث علم و فقہ کے کن ذخائر کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہیں۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ کتنے جلیل القدر اور نامور فقہا و محدثین نے اس کی شروح لکھیں۔ صاحب کشف الظنون نے اس سلسلے میں پندرہ شرحوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں:

۱- شرح الامام الحافظ ابی زکریا محی الدین یحیی بن شرف الخرامی النووی الشافعی المتوفی ۶۷۶ھ۔

۲- شرح القاضی عیاض بن الیحصبی المالکی المتوفی ۵۴۴ھ۔

۳- شرح ابی العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ۔

۴- شرح الامام ابی عبداللہ محمد بن خلیفہ الوشتانی المالکی المتوفی ۸۲۷ھ۔

۵- شرح شمس الدین ابی المظفر یوسف بن قزاد علی المتوفی ۶۵۴ھ

۶- شرح ابی الفرج عیسی بن مسعود الزواوی المتوفی ۷۴۴ھ۔

۷- شرح الشیخ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ۔

۸- شرح الامام قوام الدین ابی القاسم اسمٰعیل بن محمد الاصبہانی المتوفی ۵۳۵ھ۔

۹- شرح الشیخ تقی الدین ابی بکر الحصنی الشافعی الدمشقی المتوفی ۸۲۹ھ۔

۱۰- شرح الشیخ شہاب الدین احمد بن محمد الخطیب القسطلانی الشافعی المتوفی ۹۲۳ھ۔

۱۱- شرح مولانا علی بن سلطان محمد الھروی القاری المتوفی ۱۰۱۶ھ۔

امام مسلم نیشاپور میں اس دور میں پیدا ہوئے، جب اسلامی علوم و معارف کی اشاعت و فروغ نے پورے عالم اسلامی میں ایک طرح کی وحدت پیدا کر دی تھی اور عرب و عجم کا امتیاز علمی اور عملی سطح پر ختم ہو چکا تھا۔ آپ کی تاریخ ولادت ۲۰۴ھ ہے۔ بچپن ہی سے ذوقِ علم سے بہرہ ور تھے۔ جب عنفوانِ شباب کو پہنچے، تو اسی ذوق نے حدیث کی لگن پیدا کی۔ چنانچہ آپ نے حدیث کی طلب و جستجو میں متعدد بار سفر کی زحمتوں کو برداشت کیا۔ کبھی عراق پہنچے، اور کبھی شام و حجاز کے خم خانوں سے شرابِ طہور کے جام لنڈھائے۔ زیادہ تر بغداد میں آمد و رفت رہی۔ یہی وجہ ہے اکثر بغدادی رواۃ نے ان سے استفادہ کیا۔ شیوخ میں امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ اور یحیٰی بن یحیی نیساپوری وغیرہم ایسے جلیل القدر ائمہ فن کا نام آتا ہے۔

صحیح مسلم کے علاوہ بھی ان کی تصنیفات ہیں۔ جیسے مسند کبیر، جامع کبیر، کتاب العلل

کتاب طبقات، کتاب اوہام محدثین، کتاب تمیز، کتاب من لیس لہ الاراوٍ واحد۔ کتاب الاسماء والکنی۔

جب تک زندہ رہے محاسنِ اخلاق کو اپنائے رکھا، نہ کبھی کسی کی غیبت کی، نہ کسی کو مارا پیٹا، اور نہ کسی مرحلے پر کسی کے بارے میں سب وشتم کی نوبت ہی آئی۔

۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

جامع الترمذی : سلسلہ صحاح کی یہ تیسری اہم کڑی ہے۔ اس میں تمام ان احادیث کو جمع کیا گیا ہے جو معمول بہا ہیں۔ حاکم نے اسے الجامع الصحیح کہا ہے۔ خطیب نے اسے الصحیح کے نام سے پکارا ہے، چونکہ اس کے دامن میں سنن کا بہت بڑا اور قیمتی ذخیرہ سمٹ آیا ہے اس بنا پر اسے سنن ترمذی بھی کہا جاتا ہے۔

اس کی ترتیب فقہی انداز و اسلوب کی حامل ہے۔ اس میں صحیح وحسن احادیث کے علاوہ ضعیف احادیث بھی مندرج ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت محض شواہد ومتابعات کی ہے کیونکہ مؤلف نے خود ان کے ضعف کی نشاندہی کی ہے۔ اس میں صحابہ کرام اور مختلف بلادِ اسلامی کے علما کی آرا و مسلک پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ان کا مابہ الاستدلال کون روایات ہیں اور ان کا کیا درجہ ومقام ہے۔ اس کے آخر میں ایک فصل علل سے متعلق ہے جس میں اہم فنی اور مفید نکات درج ہیں۔ مؤلف کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی کتاب حجاز وعراق اور خراسان کے علما کو دکھائی۔ سب نے اسے پسند کیا۔

علامہ ذہبی کا کہنا ہے:

من کان فی بیتہ ھٰذا الکتب فکانما فی بیتہ نبی یتکلم۔

جس کے گھر میں یہ کتاب موجود ہو وہ سمجھ لے، کہ گویا اس کے گھر میں آنحضرت بنفس نفیس بول رہے ہیں۔

حافظ ابن الاثیر نے اپنی کتاب جامع الاصول میں یہ کہہ کر اس کی اہمیت و امتیاز کی طرف اشارہ کیا ہے :

کتاب الصحیح احسن الکتب و اکثرھا فائدۃ و احسنھا ترتیباً و اقلھا تکراراً وفیہ مالیس فی غیرہ ۔

ان کی تالیف کردہ صحیح کتب حدیث میں بہترین مقام کی حامل ہے اس میں فوائد کی کثرت ہے، ترتیب عمدہ ہے ۔ تکرار کم سے کم ہے اور ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو دوسری کتابوں میں نہیں پائی جاتیں ۔ وہ کیا خصوصیات ہیں، جو اس کا طرۂ امتیاز ہیں شاہ عبدالعزیز نے ان کو مندرجہ ذیل چار خانوں میں تقسیم کیا ہے :

۱ ۔ حسن ترتیب اور عدم تکرار ۔

۲ ۔ مذاہب فقہا اور ان کے مبنی استدلال کا ذکر ۔

۳ ۔ انواع حدیث، یعنی صحیح، حسن، ضعیف، غریب و معلل کی وضاحت و تبیین ۔

۴ ۔ رواۃ کے نام، القاب اور کنی کی تصریح ۔

ان خصوصیات کے علاوہ اس کا مابہ الامتیاز وصف یہ بھی ہے کہ اس میں جرح و تعدیل سے بھی اعتنا کیا گیا ہے ۔

متعدد حضرات نے اس کی شروح رقم فرمائیں، جیسے :

۱ ۔ قاضی ابی بکر بن العربی المالکی ۔

۲ ۔ حافظ ابن سید الناس ۔

۳ ۔ حافظ زین الدین العراقی ۔

۴ ۔ حافظ ابن الملقن ۔

۵ ۔ ابوالفرج زین الدین عبدالرحمٰن بن شہاب الدین احمد بن حسن ۔

۶ ۔ حافظ عمر بن رسلان البلقینی ۔

۷۔ علامہ محمد طاہر بن علی الصدیقی الفتنی۔

۸۔ ابوالطیب السندی۔

۹۔ شیخ سراج احمد السرہندی۔

۱۰۔ ابوالحسن بن عبدالہادی السندی المدنی۔

۱۱۔ حافظ ابن حجر عسقلانی۔

صحیح ترمذی کے مؤلف کا نام نامی محمد بن عیسیٰ بن سورہ السلمی الترمذی ہے اور ابوعیسیٰ کنیت ہے۔ تاریخ ولادت میں اختلاف ہے، حافظ ابن الاثیر نے تیسیر الوصول کے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ ان کی ولادت ۲۰۰ ہجری میں ہوئی۔

ترمذ جیحون کے کنارے ایک قدیم شہر سے تعبیر ہے۔ یہی ان کا مولد و مدفن ہے۔ اس کے تلفظ میں سمعانی نے تین وجوہ کا ذکر کیا ہے۔ بفتح التا، بضم التا اور بکسر التا۔ متداول بفتح التا ہے۔ میم کے نیچے زیر ہے۔ حافظ ابن دقیق العید نے بکسر التا کو ترجیح دی ہے۔ سلمی انھیں اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ انھیں غیلان کے ایک قبیلہ بنی سلیم کی طرف انتساب حاصل ہے۔ حدیث و سنن کے مشہور و مستند امام ہیں۔ ان کے حفظ و ثقاہت کے بارے میں سب متفق ہیں۔

متعدد شیوخ سے حدیث سیکھی۔ قیتبہ بن سعید، اسحاق بن موسیٰ، سفیان ابن وکیع اور محمد بن اسمٰعیل البخاری ایسے نامور اور جید ناقدانِ فن ان کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

ابویعلی الخلیلی کا کہنا ہے:

ثقة متفق علیه و یکفی فی توثیقه ان امام المحدثین محمد بن اسمٰعیل البخاری کان یعتمده و یاخذ عنه۔

ثقہ ہیں، اور ان کی ثقاہت سب کے نزدیک مسلمہ ہے۔ ان کی توثیق اس سے زیادہ کیا ہوسکتی ہے کہ سرخیل محدثین امام بخاری انھیں شائستہ اعتماد سمجھتے ہیں۔

اور ان سے اخذ روایت کرتے ہیں۔

آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے:

تورع و زہد بجدی داشت کہ فوق آن متصور نیست بخوفِ الٰہی لبسیار گریہ وزاری کردہ و نابینا شد۔

۲۷۹ ہجری میں فوت ہوئے۔

سنن ابی داؤد: صحاح ستہ کے سلسلۃ الذہب کی یہ چوتھی کڑی ہے۔ مؤلف کا کہنا ہے کہ میں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے نقد و تفحص کے بعد چار ہزار آٹھ سو روایات پر مشتمل یہ مجموعہ تیار کیا اور اس میں اس بات کا خصوصیت سے خیال رکھا ہے کہ صرف وہی احادیث اس میں بار پائیں، جو یا تو صحیح ہوں اور یا پھر صحیح سے تشابہ و تقارب رکھتی ہوں۔ بعض روایات میں شدید نوعیت کا وہن و ضعف بھی پایا جاتا ہے۔ اس کو میں نے اس مجموعہ میں صاف بیان کر دیا ہے۔ صحیح احادیث سے حضرت امام کی مراد وہ احادیث ہیں جو صحیح لذاتہ کے زمرہ میں داخل ہیں۔ متشابہ وہ ہیں جو صحیح لغیرہ کہلاتی ہیں اور متقارب سے مقصود وہ احادیث ہیں، جن پر حسن لذاتہ کا اطلاق ہوتا ہے۔

احادیث کا یہ انتخاب ان احادیث و سنن کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا گیا، جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح احکام و مسائل کی تفصیلات سے ہے۔ یہی وجہ ہے محدثین اور فقہا کے حلقوں میں اسے بدرجۂ غایت پسندیدگی سے دیکھا گیا ہے۔

مؤلف کا کہنا ہے میں نے اسے جب امام احمد حنبل کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے اس کی تحسین فرمائی:

الخطابی نے معالم السنن میں کہا ہے:

کتاب شریف لم یصنف فی علم الدین مثلہ و قد رزق القبول

من کافۃ الناس فصار حکما بین فرق العلماء و طبقات الفقہاء۔

یہ عمدہ کتاب ہے۔ علم دین کے بارے میں ایسی کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی اسے تمام لوگوں میں قبولیت و پذیرائی حاصل ہوئی۔ اور مختلف علما و فقہا میں اسے حکم منصف کا درجہ حاصل ہے۔

یحییٰ بن زکریا کا قول ہے کہ اصل دین بلا شبہ قرآن ہے لیکن سنن ابی داؤد کو اسلام کا ستون قرار دینا چاہیے۔

ابن الاعرابی کا قول ہے۔ اگر کوئی شخص ان علوم و معارف کا احاطہ کرے جو قرآن حکیم اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں تو مقدماتِ دین کے سمجھنے میں اسے اور کسی چیز کی حاجت نہیں۔

ابن السبکی نے طبقات میں اسے دیوانِ اسلام ٹھہرایا ہے۔

علامہ نووی کا کہنا ہے کہ جو شخص علم فقہ سے شغف و شغل رکھتا ہے اسے سنن ابی داؤد کا پوری طرح مطالعہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں ان احکام و مسائل کا بیشتر حصہ مندرج ہے جو حجت و استدلال کا مبنیٰ ہے۔

ابراہیم العربی کا قول ہے:

الین لابی داؤد الحدیث کما الین لداؤد الحدید۔

فن حدیث کو ابو داؤد کے لیے اسی طرح نرم کر دیا گیا ہے، جیسے حضرت داؤد کے لیے لوہے کو نرم کر دیا گیا تھا۔

سنن ابو داؤد کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ جن میں چند یہ ہیں:

۱۔ شرح الامام الخطابی۔

۲۔ شرح الامام نووی

۳۔ شرح الحافظ ابن القیم

۴۔ شرح سراج الدین عمر بن علی بن الملقن۔

۵۔ شرح الشیخ شہاب الدین احمد بن حسین الرملی المقدسی الشافعی۔

۶۔ شرح الشیخ قطب الدین ابی بکر بن احمد الیمنی۔

۷۔ شرح الامام ولی الدین ابی زرعہ۔

۸۔ شرح الحافظ علاء الدین مغلطائی بن قلیج۔

۹۔ شرح الشیخ شہاب الدین ابی محمد احمد بن محمد بن ابراہیم بن ھلال المقدسی۔

۱۰۔ شرح الحافظ شہاب الدین رسلان۔

۱۱۔ شرح العینی۔

۱۲۔ شرح الحافظ السیوطی۔

مؤلف کا اسم گرامی سلیمان بن الاشعث بن اسحاق السجستانی ہے۔ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ تحصیل حدیث کی خاطر عراق گئے، شام پہنچے، اور مصر و بلاد خراسان میں قیام فرمایا۔ تاکہ یہاں کے حفاظ و علما سے کسب فیض کریں۔ ان کے مشائخ میں امام بخاری، امام مسلم، امام احمد بن حنبل، ابن ابی شیبہ اور قتیبہ بن سعید ایسے عظیم المرتبت حضرات شامل ہیں۔

ان کے بارے میں حاکم کی یہ رائے ہے:

کان ابوداؤد امام الحدیث فی عصرہ بلا مدافعۃ۔

ابوداؤد بغیر کسی اختلاف کے اپنے دور میں امام حدیث کی حیثیت سے مشہور تھے۔

امام نسائی وغیرہ نے ان سے اخذ علم کیا ہے۔ ان کے علم، فہم اور ورع و زہد کا علما نے بجا طور پر اعتراف کیا ہے۔

بمقام بصرہ ۲۷۵ھ میں انتقال ہوا، اور یہیں مدفون ہوئے۔

سجستان خراسان و کرمان کے درمیانی علاقہ کا نام ہے۔

ابن ماجہ: سنن کا یہ ذخیرہ ایک ہزار پانچسو ابواب اور چار ہزار احادیث پر پھیلا ہے۔ اس میں متعدد ثلاثیات بھی ہیں۔ ابو زرعہ نے اس میں

مندرج احادیث کی توثیق کی ہے۔

شیخ عبدالحق دہلوی کا کہنا ہے:

کتابہ واحد من الکتب الاسلامیہ یقال لہ الاصول الستۃ۔

ان کی کتاب کتب اسلامیہ میں اصول ستہ میں شمار ہوتی ہے۔

کتب صحاح میں اس کا درجہ ومقام کیا ہے۔ اس کا اندازہ مؤلف کی شخصیت سے ہوتا ہے۔

ابویعلیٰ خلیلی قزوینی کا قول ہے:

کان عالما بھذا الشان صاحب التصانیف منھا التاریخ والسنن ارتحل الی العراقین ومصر والشام۔

فن حدیث کے عالم اور صاحب تصانیف ہیں۔ جن میں تاریخ اور سنن زیادہ مشہور ہیں۔ انھوں نے تحصیل حدیث کے شوق میں عراق، مصر اور شام تک تگ و تاز کی۔

ابن کثیر کا قول ہے:

صاحب السنن المشھورۃ وھی دالۃ علی علمہ وتبحرہ و اطلاعہ واتباعہ للسنۃ فی الاصول والفروع۔

سنن مشہورہ کے مصنف ہیں۔ یہ کتاب ان کے علم، تبحر، وسعت اطلاع اور سنت کی اصول وفروع میں پیروی واتباع پر دلالت کناں ہے۔

ان کو اصحاب امام مالک اور لیث بن سعد سے سماع کا فخر حاصل ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے ابراہیم بن المنذر، ابن نمیر ہشام بن عمار، ابوبکر بن شیبہ وغیرہ سے بھی استفادہ کیا۔

ابوالحسن قطان سے جلیل القدر محدث ان کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

ان کا پورا نام ابوعبداللہ بن یزید بن ماجہ ہے۔ (ماجہ ان کی والدہ

کا نام ہے)۔

۲۰۷ھ یا ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۳ھ میں فوت ہوئے۔
بہت سے لوگوں نے ابن ماجہ کی شروح لکھیں۔ ان میں محمد بن موسیٰ الامیری اور علامہ سیوطی قابل ذکر ہیں۔

سنن نسائی: فن حدیث وسنن میں بدرجہ غایت مفید و مستند ہے اس کا موجودہ نسخہ در اصل ایک طویل اور بڑی کتاب کا اختصار ہے جس میں تجرید وصحت کا مزید اہتمام کیا گیا ہے۔ سید جمال الدین کا کہنا ہے:

صنف فی اول الامر کتابا یقال لہ، السنن الکبیر للنسائی وھو کتاب جلیل لم یکتب مثلہ فی جمع طرق الحدیث وبیان مخرجہ وبعدہ اختصرہ وسماہ بالمجتبیٰ۔

ابتدا میں مصنف نے سنن کبیر کے نام سے ایک بے مثال مجموعہ احادیث ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے جلالت قدر کا حامل تھا کہ اس میں حدیث کے مختلف طرق کو نہ صرف جمع کر دیا گیا تھا بلکہ اس کے مخرج کی نشاندہی بھی کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے اس کو اختصار کے قالب میں ڈھالا، اور اس کا نام المجتبیٰ رکھا۔

وجہ اختصار یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس دور کے ایک والی نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ تمام احادیث جو اس میں درج ہیں، بلا امتیاز صحت کے درجہ پر فائز ہیں۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ نہیں، اس پر انھوں نے کہا کہ ان تمام حدیثوں کا جائزہ لو، اور ان میں سے صرف وہی احادیث منتخب کرو جو صحیح ہوں۔ امام نے اس پر عمل کیا اور سنن نبوی پر مشتمل اس عظیم المرتبت نسخہ کو مرتب کیا اور اس کا نام المجتبیٰ رکھا، جس کے معنی ہی انتخاب کے ہیں۔ اس کا ایک نام المجتبیٰ بھی ہے۔ اس کے معنی بھی ایسے نسخہ کے ہیں جس کو چھان بین کے بعد منتخب کیا گیا ہو، اور اب جب کسی روایت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نسائی سے مروی ہے تو اس کا اطلاق بھی اسی منتخب نسخے پر

ہوتا ہے۔

امام حاکم و خطیب اس کے مبالغہ آرائی کی حد تک مداح تھے۔ ان کی یہ رائے تھی کہ اس کی شرائط صحت، امام مسلم کی شرائط صحت سے بھی زیادہ کڑی ہیں۔ علامہ ذہبی اور تاج سبکی بھی قریب قریب اس معاملے میں ان کے ہم نوا ہیں۔

سیوطی اور ابوالحسن محمد بن عبدالہادی حنفی نے اس کی شروح و تعلیقات لکھیں۔

مؤلف کا نام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب الخراسانی ہے۔ بمقام نساء ۲۱۵ھ پیدا ہوئے اور ۳۰۳ھ میں وفات پائی۔ حدیث و سنن کے بہت بڑے امام تھے۔ بے شمار لوگوں سے استفادہ کیا۔

منصور الفقیہ اور احمد بن محمد بن سلامہ کا قول ہے:

ابوعبدالرحمٰن امام من ائمۃ المسلمین۔

ابوعبدالرحمٰن حدیث میں درجہ امامت پر فائز ہیں۔

ابوالحسین بن المظفر کا کہنا ہے:

سمعت مشائخنا بمصر یعترفون لابی عبدالرحمٰن النسائی بالتقدم والامامۃ۔

میں نے مصر میں اپنے مشائخ کو ابی عبدالرحمٰن النسائی کی امامت و تقدم کا معترف پایا۔

دار قطنی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ ابوبکر الحداد جو فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر الحدیث بھی تھے۔ نسائی کے علاوہ اور کسی شخص سے حدیث کی روایت نہ کرتے۔

مآخذ و مصادر

۱۔ قرآنِ حکیم

۲۔ مقدمہ فتح الباری ۔ ابنِ حجر

۳۔ مقدمہ، تحفۃ الاحوذی ۔ ابو العلی محمد عبد الرحمٰن مبارک پوری ۔

۴۔ الرسالہ ۔ امام شافعی

۵۔ معرفۃ علوم الحدیث ۔ حاکم نیساپوری

۶۔ تدریب الراوی ۔ علامہ سیوطی

۷۔ السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی ۔ ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی ۔

۸۔ علوم الحدیث و مصطلحہ ۔ ڈاکٹر صبحی الصالح

۹۔ السنۃ قبل التدوین ۔ محمد عجاج الخطیب

۱۰۔ اتحاف النبلا ۔ نواب صدیق حسن

۱۱۔ الحطۃ فی ذکر الصحاح الستہ ۔ نواب صدیق حسن ۔

۱۲۔ توجیہ النظر الی اصول الاثر ۔ الجزائری ۔